معجزۂ فن

کی ہے خونِ جگر سے نمود

(علامہ اقبالؒ کے منتخب فارسی کلام کا ترجمہ و تشریح)

ڈاکٹر جمال نقوی (علیگ)

سلطان احمد نقوی

ادارہ تزئینِ دانش، کراچی

معجزۂ فن

(علامہ اقبالؒ کے منتخب فارسی کلام کا ترجمہ و تشریح)

ڈاکٹر جمال نقوی (علیگ)

سلطان احمد نقوی

ادارہ تزئین دانش، کراچی

کتاب	معجزۂ فن
قلم کار	ڈاکٹر جمال نقوی (علیگ)
	(0321-8739362)
	سلطان احمد نقوی
	(0308-2723397)
اشاعت	2021ء
تعداد	300
صفحات	125
قیمت	250 روپے
ناشر	ادارہ تزئین دانش، ڈی۔118، کلاسک دیو، گلستان جوہر کراچی
طباعت	الحبیب پرنٹنگ سروسز کراچی۔ 0321-2156429
فون	0321-8739362

انتساب

شہدائے راہِ خدا

صاحبانِ ادب و مذہب

اور

محبانِ اردو و فارسی

اور

عاشقانِ رسول اور آلِ رسول

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

کے نام

فہرست

پیش گفتار

حکیم الامت، مفکر ملت، شاعر قدرتِ جمال علامہ محمد اقبال نے اپنے عربی و فارسی کے استاد حضرت میر حسن سے کسبِ فیض حاصل کیا اور شعر و سخن کا ذوق سلیم بھی انہی کے فیض صحبت کا مرہونِ منت ہے۔ اپنے ابتدائی طالب علمی کے دور میں وہ فطرت اور وطنیت کی طرف مائل نظر آتے ہیں مگر اپنے دوسرے دور یعنی قیام یورپ کے دوران وہ فارسی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور اہل وطن کی علمی، اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی اقدار کے انحطاط سے انہیں قدرے مایوسی ہوئی۔ خصوصاً امت مسلمہ کی حالتِ زار کو انہوں نے یوں بیان کیا:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی، ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

میونخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کیلئے ان کے مقالے کا عنوان ''ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' تھا۔ اس سلسلے میں اقبال کو قرآن کریم، کتب احادیث اور تصوف پر مختلف تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کرنا پڑا۔ اسی مطالعے نے آپ کے ذہن کو محمدؐ و آل محمدؐ (اہل بیت) کے عشق میں گرفتار کر لیا اور انہوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشق اہلِ بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِ دامن حیدر مجھے

اسی دور میں ڈاکٹر محمد اقبال نے فلسفہ اور اسلامی تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا۔ ان کی تین شہرۂ آفاق مثنویاں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی اور پیامِ مشرق کے عنوان سے ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ یہیں سے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو فلسفیوں، مفکروں اور دانشوروں کی صف میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق، زبورِ عجم، مسافر اور جاوید نامہ کے مجموعے انہی مسائل پر مبنی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی برصغیر کی قومی زبان تھی لیکن اردو کے آنے کے بعد اور پھر فارسی کے مٹ جانے کے بعد آج تک ہمارا سماج عام طور پر فارسی سے نابلد ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ ہمارے اہم شعراء خصوصاً غالب اور اقبال کے فارسی کلام کے تراجم شائع کیے جائیں تاکہ اردو دنیا ان تخلیق کاروں کی اہم تخلیقات سے واقف ہو سکے اور ان کے ادبی مقام کو سمجھ سکے۔

علامہ اقبال کی شخصیت و فن پر ہر زاویے سے کام ہوا ہے جو معیار کے ساتھ ساتھ مقدار میں بھی بہت زیادہ ہے مگر رسول اور آلِ رسول سے ان کے عشق کے بارے میں بہت کم کام نظر آتا ہے۔ اسی بات نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا کہ ہم ان کے ایسے فارسی کلام کو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ دنیائے ادب میں پیش کریں جس سے اقبال کا عشقِ رسول و عشقِ اہلِ بیت نمایاں ہو سکے اور ان کے اس اہم پہلو کو بھی اجاگر کیا جا سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم و تہذیب سے آشنا اور روشن خیال فکر رکھنے والے ایک فلسفی اور دانشور کا عشقِ محمد و آلِ محمد میں ڈوب جانا اس کے فن کا معجزہ ہی تھا، اسی لیے ہم نے اس کتاب کا نام ''معجزۂ فن'' تجویز کیا ہے۔ امید ہے علمی و ادبی حلقوں میں اسے مقبولیت حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر جمال نقوی (ٹلیگ)

پیش لفظ

اس سے قبل کہ آپ اگلے صفحات پر نظر ڈالیں چند حقیقتوں کو واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ قارئین کو کوئی امر ناگوار نہ گزرے سب سے پہلے یہ گوش گزار کر دینا بہتر ہوگا کہ اس کاوش کو کسی بھی طور ادبی پیمانے پر نہ جانچا جائے کہ یہ میرے مرتبے سے بلند تر ہے۔ یوں بھی علامہ اقبال جنہیں ہم حکیم الامت، مفکرِ اسلام، شاعرِ مشرق اور مفکرِ پاکستان جیسے القابات سے یاد کرتے ہیں ان کے کلام کی تشریح کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے ک ہر چند کہنے کو علامہ اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں اور اس ملک کے نظام کو ان کے نظریات کے مطابق چلانے کے دعوے یا خواہشات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے مگر ہماری اکثریت نے ان کا کلام پڑھا بھی نہیں ہوگا نہ ہی اس کی کوئی دانستہ کاوش کی جاتی ہے۔ جب یہ صورت حال ان کے اردو کلام ہی کے حوالے سے ہے تو جوان کا فارسی کلام ہے اس کے بارے میں کیا امید کی جاسکتی ہے۔ بہرحال کیونکہ ہم اپنی نظریاتی اساس علامہ اقبال کے بیان کیے گئے اصولوں کی بنیاد پر قائم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ا ن کے کلام کا بغور مطالعہ کریں اور اس کے مفہوم کو اس کی روح کے مطابق سمجھنے کی کوشش کریں۔

کسی بھی مفکر کے نظریات و فکر کو عملی جامہ پہنانے کے دو مرحلہ ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا اس پہلو سے جائزہ لیا جائے کہ آیا اس میں بیان کیے گئے نکات قابل عمل بھی ہیں یا نہیں۔ یعنی انسان کی حقیقی زندگی سے ان کی مطابقت ہے یا یہ صرف خیالی تصورات ہیں جن کو سوچ کے انسان صرف ایک خیالی دنیا کی خواہش سے مطمئن ہوسکتا ہے۔ یقیناً علامہ اقبال کسی ایسی تصوراتی دنیا کے فرد نہیں تھے جو صرف خواہشات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اسی لیے انہوں نے اپنے کلام میں ایسی جیتی جاگتی ہستیوں کا تذکرہ بہ کثرت کیا ہے جو نہ صرف ہماری بلکہ تاریخ انسانیت کا اہم ترین حصہ ہیں تا کہ ان کی فکر و دانش سے رہنمائی حاصل کرنے کے خواہش مندان کے کرداروں کی عملی زندگی

کا مطالعہ کر کے رہنمائی حاصل کر سکیں اور اپنی زندگی میں ان کے نقش قدم پر گامزن ہو کر اس منزل کو حاصل کر سکیں جس کی خواہش علامہ اقبال نے کی تھی، یہی ان کی فکر کا دوسرا مرحلہ ہے۔

علامہ اقبال کے کلام کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو اس میں خاصی تعداد میں مختلف شخصیات کا تذکرہ بھی نمایاں طور پر مل جاتا ہے جن میں نہ صرف دنیاوی طور پر عام افراد کے علاوہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب کی اہم ہستیوں کا ذکر بھی ہے۔ انہوں نے نظم صدیق جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو خراج عقیدت پیش کیا اور بلالؓ جیسی نظموں کے ساتھ ہی رام اور گرونانک کے حوالے سے بھی اشعار مل جاتے ہیں۔ عام شخصی حوالے سے غالب، سرسید، حالی، شبلی، داغ، رومی، عرفی، شیکسپیئر، لینن وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں لیکن جن ہستیوں کا یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس خانوادے کا تذکرہ اور جس سے انہوں نے تسلسل کے ساتھ ابتدا سے لے کر انتہا تک اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ حضرت محمدؐ کی ذات گرامی اور ان کے اہلبیت ہیں۔ یعنی حضرت علی، سیدہ فاطمہ الزہرہ اور ان کے صاحبزادگان امام حسن اور امام حسین ہیں جن کے کردار و عمل کو اسلامی نظام حیات کی مثال قرار دیا جاسکتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر امت مسلمہ عالم انسانیت میں اپنا اصل مقام حاصل کر سکتی ہے۔ یوں تو اس حوالے سے ہمارے ادب میں بے شمار اشعار نہ صرف کہے جاچکے ہیں بلکہ ان کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا مگر اقبال نہ صرف اسلامی فکر و فلسفہ پر مکمل عبور رکھتے تھے بلکہ ان کی نظر اسلامی اور مسلمانوں کی تاریخ پر بھی بہت گہری تھی، اسی لیے ان کے ذہن سے بیان کیا ہوا خیال نہ صرف عقیدت کا اظہار ہوگا بلکہ حقیقی معنی میں قابل عمل بھی ہوگا۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کیونکہ ہم علامہ اقبال کو اپنی قوم اور ملک کا نظریاتی رہنما قرار دیتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے تصور سے مکمل آگاہی حاصل کریں جن میں ہماری ترقی اور نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ گزشتہ چھ سات دہائیوں میں جو ہمارا ادبی المیہ رونما ہوا وہ فارسی سے نابلد ہونے کے باعث ہے جیسا کہ ہمارے ادب کا ہر طالب علم اس امر سے واقف ہے کہ وہ تمام شعراء جن کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے وہ اپنے پیچھے ایک عظیم خزانہ

فارسی کلام کی صورت میں بھی چھوڑ کر گئے ہیں جس سے موجودہ نسل قطعی طور پر ناواقف ہے۔ علامہ اقبال کا شمار بھی انہی شخصیات میں ہوتا ہے جن کے فارسی کلام کا مطالعہ کیے بغیر ان کی فکر کا مکمل طور پر ادراک نہیں کیا جاسکتا ہے، اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے کلام کا وہ حصہ جو براہِ راست آج کے مسائل، اس کے حل اور موجودہ نسل کی رہنمائی اور تربیت سے ہے تاکہ اس کو سامنے لایا جائے۔ نظریاتی طور پر ایک باکردار گروہ تیار ہو سکے جس کی مثال علامہ اقبال نے اس مجموعہ میں شامل اشعار میں ہماری رہنمائی کے لیے دی ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار کر دینا بھی بیجا نہیں ہوگا کہ رسولؐ اور اہلبیت کی ہستیوں کو دو پہلو سے دیکھا جاسکتا ہے بلکہ دیکھا جاتا ہے، ایک تو عقیدہ کی بنیاد سے ظاہر ہے جس کو اولین حیثیت حاصل ہے کیونکہ ان پر مکمل ایمان لائے بغیر کوئی فرد دائرۂ اسلام میں داخل ہو ہی نہیں سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا دوسرا پہلو جس کی روشنی میں ان کی ہستی کا جائزہ لیا جاسکتا ہے، وہ ان کا انسانی اور تاریخی کردار ہے کیونکہ ان کے افکار و عمل تمام بنی نوع انسان کے لیے ہیں جس کی عملی رہنمائی کے لیے وہ اس دنیا میں آئے تھے، اسی لیے صاحبانِ علم اس حقیقت سے واقف ہیں، ان کے عقیدت مندوں کا دائرہ کسی مخصوص قوم یا علاقے تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ گروہ جو عقیدے کے لحاظ سے ہمارا ہم خیال نہیں بھی ہے وہ اپنے انداز میں ان ہستیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ابتداً ان اشعار کا منظوم و نثری ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی جن میں علامہ اقبال نے رسولؐ و آلِ رسول سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے اصولوں، طریقۂ کار اور نقشِ قدم پر عمل کرنے کو ہی انسانیت کی نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہاں اس امر کا دوبارہ اظہار کرنا ضروری ہے کہ ترجمہ کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ انتہائی سادہ اور مختصر انداز سے جس قدر بھی ممکن ہو شعر کا مفہوم بیان کر دیا جائے۔ ویسے بھی علامہ اقبال کے اشعار کا ان کے مفہوم و معیار کے مطابق ہر دو طریقہ سے ترجمہ کرنا بجائے خود ایک کارِ دارد ہے۔ آخر میں ہم ابن حسن پریس کے محمد حسن اور جمیل (برخورداران) کے شکر گزار ہیں۔

سلطان احمد نقوی

در بیان مصطفیٰؐ

خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما زنام مصطفیٰ است

☆☆☆☆

ہے دل مسلم مقام مصطفیٰ
آبرو اس کی ہے نام مصطفیٰ

ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو اسلام کا پیروکار کہتا ہے اور سچا و حقیقی مسلمان سمجھتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کی محبت سے سرشار اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں اور راستوں کو اختیار کرے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہر مسلمان کا دل رسولؐ کی محبت اور ان کے نور سے روشن نہ ہو۔ اقبال اس شعر میں حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ ہر حقیقی اور سچے مسلمان کا دل اپنی رسولؐ کی محبت سے لبریز ہے اور یہی آپؐ کا حقیقی مقام ہے، اسی نام سے ہر سچے مسلمان کی آبرو اور عزت ہے اور اسی سے منسلک رہنا ہمارے فخر کا باعث ہے۔

طور موجے از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

☆☆☆☆

اس کے در کی خاک سے روشن ہے طور
کعبے میں روشن ہے ابتک جس کا نور

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی ذات ہی اس کائنات کی تخلیق کا باعث اور یہاں قدرت کے جو بھی مظاہر ہیں وہ آپؐ ہی کی وجہ سے ہیں، اسی خیال کو اقبال اس شعر میں بیان کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کوہِ طور پر جو روشنی ہے وہ آپؐ کے در کی خاک سے بھی کم تر ہے اور اسی خاک کی وجہ سے کوہِ طور روشن ہے اور آج کعبہ میں جو ایمان کی روشنی اور تقدس کا وجود ہے وہ بھی حضرت محمدؐ کی ذات ہی کی وجہ سے ہے جنہوں نے کعبہ کو کفر کی تمام علامتوں سے پاک کیا۔

کمتر از آنے ز اوقاتش ابد
کاسب افزائش ازذاتش ابد
☆☆☆☆
یہ ابد کمتر ہے بیشک آپ کی اوقات سے
ہاں! فروغ اس کو ملا ہے آپ ہی کی ذات سے

مسلمانوں کے دین کے جو بنیادی عقائد ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کائنات میں جو شے خدا نے سب سے پہلے تخلیق کی وہ حضرت محمدؐ کا نور تھا جس کی ابتدا کا تعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی انتہا متعین کی جا سکتی ہے۔ یہ ابد سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اسی لیے اس کو وقت اور زمانے کے محدود دائرے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ اقبال کے اس شعر کا یہی مفہوم ہے، وہ کہتے ہیں کہ زمانے کی ابتداء اور انتہا آپ کی ذات کے حوالے سے محدود اور کمتر ہے، ہاں البتہ آپ کی ذات کے وجود کی وجہ سے وقت کو عزت و وقعت ملی جو ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔

بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسریٰ زیر پائے امتش
☆☆☆☆
فقر میں عظمت ہوئی جس کی نہ کم
تاج کسریٰ اس کے تھا زیر قدم

علامہ اقبال کی فلسفہ شاعری میں جو مثالی کردار ہیں ان میں جس بنیادی وصف کا ہونا ضروری ہے ان میں سے ایک فقر بھی ہے جس سے مراد کردار کا وہ پہلو ہے جہاں انسان اپنی نفسانی خواہشات پر غلبہ پالیتا ہے اور صرف اللہ کی رضا و رقبت کا تابع ہو جاتا ہے اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی مادی پیشکش اسے اپنے راستے سے الگ نہیں کر سکتی۔ دنیا کے لیے اس کی سب سے بڑی مثال رسولؐ اللہ کی ذات ہے جن کے فقر سے ان کی عظمت و توقیر میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ تاریخ کی سب سے بڑی سلطنتیں ان کے قدموں میں آ کر زیر ہو گئیں۔

در شبستان حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
٭٭٭٭
غارِ حرا میں آپؐ نے کی اتنی عبادت
آئین۔ دیا قوم کو. پائی جو رسالت

رسولؐ اللہ کا بعثتِ نبوی سے قبل یہ معمول تھا کہ آپ مکہ سے باہر ایک پہاڑ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے وہ وہاں راتوں کو اکیلے عبادت کرتے، انسانیت کی بھلائی کے لیے غور وخوص کرتے۔ ایسے آپ نے چالیس سال گزارے جس کے نتیجے میں ایک وقت وہ آیا کہ اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی اور آپ کی رسالت کے اعلان کا حکم ہوا، اس تمام ریاضت اور اللہ کے پیغام کو عام کرنے کی وجہ سے بہت کم عرصے میں قوم کو نہ صرف قرآن کی صورت میں ایک بہترین آئین مل گیا بلکہ حکومت اقتدار اور طاقت بھی مل گئی۔

ماند شبہا چشمِ او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم
٭٭٭٭
زندگی بھر کیں یوں شب بیداریاں
قوم کو آئیں نہ کچھ دشواریاں

اقبال حضرت محمدؐ کی زندگی کے اس پہلو کا تذکرہ کر رہے ہیں جہاں رات و دن کی کوئی قید نہیں تھی اور وہ ہر وقت قوم کی بہتری و برتری کی تدبیروں اور طریقوں کے بارے میں سوچا کرتے تھے اور جس کے نتیجے میں اور ان پر عمل کرتے ہوئے ایک پسماندگی اور جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی قوم چند چند برس میں ایسی ترقی یافتہ اور طاقت ور قوم بن گئی جس کے آگے تخت خسروی کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہی۔

وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز

☆☆☆☆

جنگ کے میدان میں دی آپ نے دشمن کو مات
آپ کا گریہ عبادت میں تھا ملت کی نجات

آنحضرتؐ کا طریقہ اور کردار موقع محل کی مناسبت سے مختلف ہوتا تھا جو ان کی کامیابی وکامرانی کا باعث بنتا تھا، اسی حقیقت کو اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ جب میدان میں جنگ خدا اور اسلام کے دشمنوں سے سامنا ہوتا تھا تو آپ کی تلوار بڑی سے بڑی رکاوٹ کا بھی خاتمہ کر دیتی تھی اور مخالف کو شکست ہوتی تھی لیکن جب آپ خدا کی عبادت کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے تو خدا کی محبت میں اتنے منہمک ہو جاتے کہ آپ کو کسی دوسری شے کا خیال نہیں آتا تھا اور آپ کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں۔

در دعائے نصرت آمیں تیغ او
قاطعِ نسل سلاطیں تیغ او

☆☆☆☆

کی جنگ بھی رسولؐ نے، حق سے دعا کے ساتھ
دشمن کی نسل کاٹ دی اپنی وغا کے ساتھ

اسلام دشمنوں کے خلاف رسولؐ اللہ جب بھی جنگ کے لیے جاتے تھے تو آپ کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جنگ سے پہلے خدا کے حضور مسلمانوں کی فتح ونصرت کے لیے دعا کرتے تھے اور پھر آغاز ہوتا جس کی وجہ سے انہیں دشمن کو شکست دینے میں مشکل نہیں ہوتی تھی، اس طرح نہ صرف یہ کہ دشمن ختم ہو جاتا بلکہ اس کی آنے والی نسل بھی آپ کی تلوار کا شکار ہو جاتی تھی اور مسلمان ہمیشہ کے لیے فتحیاب ہو جاتے۔

درج جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوام پیشیں در نورد

☆☆☆☆☆

آپ نے بدلا یوں قوموں کا چلن
دین حق آیا مٹا طرز کہن

اسلام سے پہلے اہالیان عرب عموماً اہالیان مکہ خصوصاً جہالت کے اندھیرے میں غرق تھے اور غیرانسانی رسم درواج کے پیرو کار تھے۔ جھوٹے خداؤں کی پوجا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، غلاموں اور کنیزوں کی خرید وفروخت وغیرہ عام تھی لیکن آنحضرتؐ کے سچے اور آفاقی پیام نے اس سب کے خلاف آواز بلند کی اور اس کو عام کیا جس کی وجہ سے ایک سچا اور حقیقی دین اختیار کیا، اس پر عمل کیا اور پرانے نظام کا خاتمہ ہوا۔

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ ام گیتی نزاد

☆☆☆☆

دین کی کنجی سے جس نے وا کیا دنیا کا در
اس کا جیسا اور نہ دھرتی نے کیا پیدا بشر

اسلام وہ واحد مذہب ہے جس میں دین اور دنیا کو برابر کی اہمیت دی گئی ہے۔ عبادات کے ساتھ ساتھ دنیاوی اعمال کی بھی اہمیت ہے جو عبادات کی۔ ایک دوسرے کے بغیر ہمارا دین مکمل نہیں ہوتا، اسی حقیقت کو اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ جس ہستی نے دنیا کے راستوں کا دروازہ کھولا ہے اور دنیاوی علم وعمل کی تلقین کی ہے اور اس کی کنجی دین کو قرار دیا ہے وہ آنحضرتؐ کی ذات ہے اسی لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اس جیسی دوسری ہستی دنیا میں نہ آئی ہے اور نہ آئے گی۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بریک خواں نشست
☆☆☆☆
ان کی نظروں میں برابر ہی رہے انساں تمام
ساتھ کھانا کھاتے تھے، آقا ہو یا کوئی غلام

اسلام کی بنیادی تعلیم اور اصولوں میں ایک انسانوں کے درمیان برابری کے رشتے کا ہے، اس کے نظریہ میں نہ امیر کو غریب پر، نہ کالے کو گورے پر، نہ آقا کو غلام پر اور نہ حاکم کو محکوم پر برتری ہے، سوائے اس کے اعمال سے اس اصول کا عملی مظاہرہ حضورؐ اپنے رفقاء کو زندگی بھر کر کے دکھاتے رہے تا کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلیں، اقبال کے اس شعر میں اسی نظریہ کی عملی شکل کا ذکر ہے کہ آپ کی نظر میں سب انسان برابر تھے اسی لیے سب ساتھ کھانا کھاتے تھے، اٹھتے بیٹھتے تھے، چاہے وہ آقا ہو یا غلام۔

در مصافے پیش آں گردوں سریر
دخترِ سردار طے آمد اسیر
☆☆☆☆
بھیجے گئے کچھ قیدی جو دربار کے اندر
اک لڑکی تھی جو حاتم طائی کی تھی خواہر
☆☆☆☆
پائے در زنجیر وہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
☆☆☆☆
بے پردہ تھی اور پاؤں میں زنجیر پڑی تھی
گردن کو جھکائے ہوئے شرمندہ کھڑی تھی
☆☆☆☆

دخترک راچوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیشِ روئے او کشید

☆☆☆☆

سرکار سے دیکھا نہ گیا آہ یہ منظر
خود اپنی ردا ڈالدی اس بیٹی کے سر پر

اقبال ان اشعار میں ایک جنگ کے بعد کا واقعہ بیان کررہے ہیں، جس میں آنحضرتؐ کی رحمت، شفقت اور انسانوں سے محبت کا ذکر ہے کہ جب ایک جنگ کے بعد کچھ قیدی حضورؐ کے سامنے پیش کیے گۓ تو ان میں ایک لڑکی بھی تھی جو مفتوح بادشاہ کی بیٹی تھی۔ قیدی ہونے کے ناطے اس کے سر پر چادر نہیں تھی اور پردے کا کوئی اور طریقہ بھی نہیں تھا۔ اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی تھی، قیدی ہونے کی وجہ سے وہ ڈری ہوئی اور شرمندہ کھڑی تھی۔ مگر جب حضورؐ نے اُسے دیکھا تو آپ کی رحم دلی جوش میں آ گئی اور آپؐ نے اپنی چادر اس لڑکی کے سر پر ڈال دی تا کہ اس کی بے پردگی کا ازالہ ہو سکے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا جو لقب رحمت اللعالمین ہے وہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں وہ تمام عالم انسانیت کے لیے ہے۔ چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم، دوست ہو یا دشمن آپ کسی کی بھی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے اور آپؐ اُسے اپنے سایہ رحمت میں پناہ دیتے تھے۔

ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوام جہاں بے چادریم

☆☆☆☆

طائی کی بیٹی سے بھی عریاں ہیں ہم
سارے عالم میں تہی داماں ہیں ہم

☆☆☆☆

روزِ محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

☆☆☆☆

روز محشر آپ پر ہے اعتبار
اس جہاں میں آپ ہی ہیں پردہ دار

بادشاہی کی بیٹی کی حالت زار کی مثال سامنے رکھتے ہوئے اقبال ان اشعار میں حضورؐ کی امت کی حالت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی حالت اس دنیا میں بادشاہ کی بیٹی سے بدتر ہے جس طرح اس کے سر پر چادر نہیں تھی اور پاؤں میں زنجیر تھی، اسی طرح آج ساری امت بے پردگی کا شکار ہے اور پابزنجیر ہے۔ اقوام عالم میں اس کی وقعت وعزت نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ پستی کا شکار ہے اس پسماندگی سے نجات پانے کے لیے جس طرح ہمیں روز محشر آپ کی مدد و اعانت کا یقین ہے اسی طرح اس جہان فانی میں بھی ہم آپؐ ہی سے مدد مانگتے ہیں تاکہ اس حالت کا خاتمہ ہو کیوں کہ آپؐ ہی ہمارے سب سے بڑے مہربان اور ہمدرد ہیں۔

حکمراں باید شدن برخاکِ خویش
تا مئے روشن خوری از تاکِ خویش

☆☆☆☆

نفس امارہ کو کرنے دو نہ ہرگز بھی خروج
گر تمہیں منظور ہے دنیا میں روحانی عروج

یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان جب اپنی مادی خواہشات کو ایک حد سے زیادہ بڑھا لیتا ہے تو اس کو نہ اپنے جذبات پر قابو رہتا ہے اور نہ ہی اس کی نفسانی خواہشات قابو میں رہتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا رویہ دیگر انسانوں اور مخلوق خدا کے مقابلے میں خودغرضانہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی کامیابیوں میں دوسروں کو شریک نہیں کرتا۔ اقبال نے اسی رویہ کو یہاں بیان کیا ہے کہ ہم دنیا میں عزت اور عروج چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ذاتی جذبات و نفسانی خواہشات پر قابو پانا ہوگا اور اجتماعی سوچ و رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است
☆☆☆☆
خاک ہوجانا حقیقت میں ہے بس پروانگی
خاک پر قابو اگر رکھیں تو ہے مردانگی

ہمارے معاشرے میں ایک گروہ اس خیال کا بھی ہے کہ انسان کو اپنی شخصیت کو اتنا کمتر کرتے جانا چاہیے کہ اس کا وجود ہی مٹ جائے اور لوگ اسے بالکل درگزر کردیں اور دنیا کے لیے وہ غیر معروف ہوجائے، اس کے لیے عام طور پر پروانے کی مثال دی جاتی ہے کہ وہ شمع کی محبت میں جل کر خاک ہوجاتا ہے مگر اقبال کے خیال میں اپنی ہستی کو اس طرح مٹادینا کسی دانشمندی کی علامت نہیں، نہ ہی مردوں کا شیوہ ہے بلکہ اصل بہادری تو یہ ہے کہ بجائے خود خاک ہوجانے کے زمین اور اس میں موجود اشیاء کو اپنے قابو میں کیا جائے۔

لطف و قہراو سرز پا رحمتے
آں بیاراں این باعدا رحمتے
☆☆☆☆
قہر و لطف سب آپ کے رحمت بنے
قہر غیروں کیلیے اور لطف اپنوں کے کیلیے

انسان اپنی تمام تر علمی اور سیاسی ترقی کے باوجود ابھی اس کائنات کی حدود کا تعین نہیں کر پایا ہے مگر اس کی تخلیق کرنے والی ہستی ایک ہی ہے وہ خدا کی ہے اسی لیے رب العالمین کہا گیا ہے اور اسی نے انسان کی ہی نہیں بلکہ تمام عالمین میں موجود مخلوقات کی تربیت اور راہِ حق کی نشاندہی کے لیے جس ہستی کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا وہ حضرت محمدؐ کی ذات گرامی تھی۔ آپ کا لطف کرم اپنوں پر تو ہوتا ہی تھا مگر مخالفین پر جو بظاہر قہر ہوتا تھا اس کا مقصد ان پر ظلم نہیں بلکہ ان کو راہِ حق پر لانا ہوتا تھا تاکہ ان کی زندگی سنور سکے۔ یہی نکتہ علامہ اقبالؔ نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

آں کہ براعدا درِ رحمت کشاد
مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

☆☆☆☆

فتح مکہ میں سبھی پر آپؐ کی رحمت تھی عام
استفادہ کر رہے تھے معافی نامے سے تمام

اس شعر میں فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر اسلام کی رحمت کی جانب اشارہ ہے، یہ تاریخ انسانی کا ایک منفرد واقع ہے کہ جب حضرت محمدؐ نے کفار مکہ کی بداعمالیوں سے تنگ آ کر مکہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور لشکر لے کر وہاں پہنچے تو کفار نے بغیر کسی جنگ کے آپ کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور لشکر اسلام شہر میں داخل ہو گیا۔ عام طور پر ایسے موقع پر فاتح مفتوحہ لشکر کے ساتھ بدلہ لینے کی غرض سے قتال کرتا ہے مگر آپ کیونکہ رحمت اللعالمین تھے اس لیے تمام لوگوں کو معاف کر دیا۔ اس کے باوجود کہ ان میں وہ افراد بھی شامل تھے جنہوں نے آپؐ اور دیگر مسلمانوں کو زندگی بھر پریشان کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا، اس طرح عفوودرگزر کی عالی ترین مثال قائم کی۔

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نور دو چشیم و یکیم

☆☆☆☆

ایک ہیں سارے مسلماں گو کہ انکے گھر انیک
جس طرح آنکھیں ہیں دو اور نور ایک

اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسانوں کو کسی بھی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا، وہ کسی بھی رنگ کے ہوں، کوئی زبان بولتے ہوں، علاقہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہو، نسل کوئی ہو، کسی بھی منصب پر فائز ہوں مگر ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ ان کے درمیان تقسیم کا واحد پیمانہ تقویٰ یعنی ان کے اعمال دینی و دنیاوی ہیں، اسی لیے مسلمانوں کو قوم نہیں امت قرار دیا گیا ہے، اسی لیے علامہ اقبال اس شعر میں اسی کی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ ہم وطن

کی قید میں ہونے کے باوجود وطن سے آزاد ہیں اور ایک ہی امت ہیں، بالکل اسی طرح کہ بظاہر ہماری آنکھیں الگ ہیں لیکن ان کا نور اور دکھائی دینے والی شے ایک ہی ہے۔

از حجاز و چین و ایرا نیم ما
شبنمِ یک صبح خندا نیم ما

☆☆☆☆

رہ رہے ہیں ہم حجاز و چین و ایراں میں مگر
مثل شبنم ضوفشاں ہے ہر جگہ ہر اک بشر

اگر ہم مسلمانوں کی تاریخ پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں تو یہ اندازہ ہو جائے کہ ابتدا سے ہی ہم تقسیم اور اختلاف کے عمل سے دوچار ہو گئے تھے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری وساری ہے۔ علامہ اقبال اس صورت حال سے مایوس تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا کیا ہے اور یہ خواہش کی ہے کہ مسلمان نیل کے ساحل سے لے کر خاک کاشغر تک ایک ہوں، اسی تصوراتی صورتحال کو انہوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ بظاہر ہم دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں، جن میں عرب، چین اور ایران وغیرہ شامل ہیں، رہ رہے ہیں مگر ہم شبنم کے ان قطروں کی طرح ہیں جو صبح صادق کے وقت سورج کی پہلی کرن میں چمکتے ہیں۔

مستِ چشمِ ساقی بطحا ستیم
در جہاں مثلِ مے و مینا ستیم

☆☆☆☆

ساقی بطحا کی آنکھوں سے ملا ہم کو وہ جام
متحد ہیں اس جہاں میں جس سے آقا کے غلام

مسلمانوں کے ایمان وعقائد کے مطابق خدا کی ذات واحد کے بعد جو ہستی سب سے زیادہ قابل احترام ہے وہ حضرت محمدؐ کی ذات ہے جو خدا کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجے جانے والے آخری پیغمبر ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں حق وصداقت کی راہ دکھائی اور اس پر چلنے کے نہ صرف طریقے بتائے بلکہ ان پر عمل کر کے بھی دکھایا تا کہ ہم اس کی تقلید کر سکیں، اسی لیے اپنے تمام اختلافات

کے باوجود ہم جس مرکزی ہستی کے گرد جمع ہو سکتے ہیں وہ آپ کی ذات ہے اِسی حقیقت کو علامہ اقبال نے شاعرانہ پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح مے و مینا کے شریک ایک دوسرے سے ربط رکھتے ہیں اسی طرح آپ کی ذات سے محبت کرنے والے بھی یکجا ہیں۔

امتیازاتِ نسب را پاک سوخت
آتش او ایں خس و خاشاک سوخت
☆☆☆☆
امتیازاتِ نسب کو خود مٹایا آپؐ نے
آگ جو اس سے لگی اس کو بجھایا آپؐ نے

انسان اپنی تخلیق کے ابتدائی دور سے ہی کسی نہ کسی انداز سے گروہ بندی کا شکار رہا ہے اور مختلف حوالوں سے یہ تفریق پیدا کی جاتی رہی ہے جن میں نسل، قوم، زبان، تہذیب و تمدن سب ہی شامل ہیں اور ہر طاقت ور گروہ اپنے سے کمزور پر غلبہ حاصل کرتا رہا ہے لیکن یہ رویہ کیونکہ انسانیت کے برخلاف ہے اس لیے تاریخ میں اس کی بیخ کنی کے لیے بھی تحریکیں چلتی رہی ہیں اور اس کے لیے خدا نے اپنے منتخب بندوں کو اصلاح کے لیے بھیجا، اِن میں آخری ہستی حضرت محمدؐ کی ذات ہے۔ اس شعر میں علامہ اقبال نے یہی نکتہ بیان کیا ہے کہ آپؐ نے انسانوں کی تقسیم کے جتنے عوامل ہیں ان کو مٹا دیا اور اس وجہ سے معاشرے میں لگی ہوئی آگ کو بجھا دیا۔

چوں گلِ صد برگ مارا بو یکیست
اوست جانِ ایں نظام و او یکیست
☆☆☆☆
ہیں اگر صد پنکھڑیاں گل کی مگر ہے ایک باس
جس طرح اک دین ہے لیکن مسلماں صد لباس

علامہ اقبال کے فلسفہ اور شاعری کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی علاقے کے ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں، رنگ و نسل کتنی ہی جدا ہو، وہ ایک امت کا حصہ ہیں۔ ان کا نفع و نقصان ایک ہے اسی لیے وہ اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے کلام میں تسلسل سے بار بار کرتے ہیں

اور اس کی مثالیں اردگرد میں موجود اشیاء سے دیتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وہ اسی امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ جس طرح ایک باغ میں مختلف پھول ہوتے ہیں جن میں سیکڑوں کی تعداد میں پنکھڑیاں ہوتی مگر ان سب کی خوشبو ایک ہی ہوتی ہے، اسی طرح مسلمانوں میں بھی اتحاد و اتفاق ہوتا کہ ان کا اثر ورسوخ مشترکہ ہو۔

شور عشعش در نئے خاموشِ من
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

☆☆☆☆

عشق احمد سے سکون دل کو ہیجانی ملی
اور دلِ پُرسوز کو ان کی ثنا خوانی ملی

جذبہ عشق اور احساس خودی علامہ اقبال کے فلسفہ کے بنیادی نکات ہیں اور ان کے بغیر بندہ مومن کا تصور ممکن نہیں جو تمام دنیاوی مفاد سے بلند تر ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے دل میں حضرت محمدؐ کی معارفت اس درجہ جگہ بنائے کہ ہماری نظر کسی دوسری جانب اٹھ ہی نہ سکے اور ہر مادی خواہش بے معنی ہو جائے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ میرے دل کو جب تک عشق رسولؐ نے مکمل طور پر مسخر نہیں کر لیا تھا وہ خاموش تھا لیکن جب وہ اس سے روشناس ہوا اس میں معرفت کے ہزاروں نغمے گونج اٹھے اور ان میں حق کے حصول کے لیے نیا جوش وولولہ پیدا ہو گیا جو عشق کا اصل اظہار اور مقصد ہے۔

من چہ گویم از تولایش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ اوگریست

☆☆☆☆

کیا بتاؤں میں کہ ہے یہ عشق کیا
خشک لکڑی میں بھی جس نے سوزِ غم پیدا کیا

علامہ اقبال کے خیال میں عشق ایسا جذبہ ہے کہ انسان تو اس سے متاثر ہوتا ہی ہے لیکن اگر کسی ایسی شے جو بظاہر بے جان نظر آتی ہے اور اس کے جذبات بھی نہیں، کسی فرد کے کثرت استعمال کی

وجہ سے اس کا تعلق قائم ہو جائے اور کسی طرح سے یہ ختم کر دیا جائے تو وہ بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس شعر میں آپ کا اشارہ اس حدیث کی جانب ہے جس کے مطابق حضرت محمد لوگوں سے خطاب کے وقت جس عصاء کا سہارا لیا کرتے تھے اس سے ممبر تعمیر ہو جانے کی وجہ سے حضورؐ نے چھوڑ دیا تھا تو اس میں سے بھی غم کے مارے رونے کی آواز آتی تھی لیکن آپؐ نے جب اس پر دوبارہ ہاتھ رکھا تو یہ آوازیں بند ہو گئیں، یہ آپ کی ذات کا ایجاز تھا۔

ہستی مسلم تجلی گاہ او
طورہا بالدز گرد راہ او

٭٭٭٭

ہم مسلمانوں کے دل ان کی تجلی گاہ ہیں
طور کے جلوے بھی اس آقا کی گرد راہ ہیں

حضرت محمدؐ سے محبت و عقیدت رکھنا اور ان کی نبوت پر یقین کامل ہونا مسلمانوں کے عقائد کا بنیادی ولازمی جز ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر گامزن ہونا اور ان کی ہدایت پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر درحقیقت کوئی مسلمان ان اصولوں پر کاربند ہو جائے تو اس کی شخصیت آپؐ کے نور سے روشن ہو جاتی ہے جس کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کوہِ طور کی طرح خدا اپنا جلوہ دکھائے کیونکہ آپ کی شخصیت کے لیے یہ واقعہ بھی گرد راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ سچے مسلمان کا دل اور ہستی آپؐ کے نور کامل سے روشن ہوتی مگر یہ منزل خاص کرنا ہر ایک کو نصیب نہیں کیونکہ یہ کارگاہ عشق میں قدم رکھنا ہے۔

پیکرم را آفرید آئینہ اش
صبح من از آفتاب سینہ اش

٭٭٭٭

میرا پیکر ان کا آئینہ ہوا
دن مرا اس نور کا سینہ ہوا

اس شعر میں اقبالؔ اپنی اس کیفیت کا بیان کر رہے ہیں جو عشق رسولؐ میں ان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عقیدت رسولؐ سے اس درجہ سرشار ہوں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا سراپا وجود ان کی ہدایات اور بتائے ہوئے اصولوں کے سانچے میں ڈھل گیا ہے اور آپؐ کا نور میرے وجود اور روح میں اتر گیا ہے اور اس کی کرنیں میرے شفاف دل کے آئینے سے منعکس ہو کر روشنی پھیلا رہی ہیں، اسی لیے میرے دن کی ابتداء سورج کی روشنی سے نہیں بلکہ اس نورِ ہدایت کی بنائی ہوئی روشنی سے ہوتی ہے جس کے عشق حقیقی سے میرا دل اور وجود سرشار ہے۔

چشم در کشتِ محبت کاشتم
از تماشا حاصلے بردا شتم
☆☆☆☆
آنسوؤں سے میں نے سینچا کشتِ الفت کو سدا
تب کہیں جا کر مجھے دیدار کا تحفہ ملا

ہر سچے مسلمان کی یہ دلی حسرت ہوتی ہے کہ اسے اپنے آقا و رسولؐ کا دیدار نصیب ہو جس کی آج کے دور میں یہی صورت کہ ہم ان کی صدق دل سے پیروی کریں اور بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کریں جس کی آگاہی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کا علم حاصل کریں اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں، اسی کیفیت کو اقبالؔ نے یہاں بیان کیا ہے کہ میں نے آپؐ کے دیدار کی خواہش کی آبیاری اپنے آنسوؤں سے کی اور آپؐ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہر طریقہ اختیار کیا اور تکلیف اٹھائی، تب کہیں جا کر آپؐ کا قرب حاصل ہوا جو آپؐ کے دیدار ہی کی طرح ہے اور میری حسرت پوری ہوئی۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتراست
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبراست
☆☆☆☆
ہے مدینے کی زمیں اس واسطے فخر جہاں
میرے آقا کا ہے مرقد بھی وہاں

ہر عاشق کو اپنے محبوب سے منسوب ہر شے اچھی لگتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اور پھر اگر عاشق عقیدت کی حد تک عشق حقیقی رکھتا ہو وہ بھی اس ذات سے جو محبوب خدا ہو تو اس سے منسوب ہر شے کی قدر و منزلت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی، اسی لیے اقبال عشق رسولؐ میں مدینہ کے ریگستان کی بے آب و گیاہ ریت کو بھی دو عالم کی ہر شے سے زیادہ برتر قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں دنیا کی سب سے عظیم ہستی کا روضہ مبارک ہے، اس سے زیادہ بڑھ کر اور کوئی قابل عزت امر نہیں ہوسکتا۔

در تپید و مسبدم آرام من
گرم تر از صبح محشر شام من

☆☆☆☆

ان کے سوز عشق سے ہر دم مجھے آرام ہے
صبح محشر سے زیادہ گرم میری شام ہے

یہ عام مشاہدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بے قرار رہتا ہے لیکن محبوب کے خیال میں بھی بے قراری کے باوجود آرام کا پہلو بھی ہوتا ہے مگر جب یہ کیفیت عشق حقیقی اور عقیدت کے جذبات کے ساتھ ہو تو یہ دوبالا ہوتی ہے اور اس میں جو آرام و راحت ہوتی ہے اسے صرف وہی محسوس کرسکتا ہے جو اس سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اس شعر میں علامہ اقبال اسی حالت کا بیان کررہے ہیں کہ عشق رسولؐ میں تڑپ اور بے چینی ان کے لیے تکلیف کا باعث نہیں بلکہ آرام و سکون کا باعث ہے، ہر چند کہ اس کا اضطراب روز محشر کی کیفیت سے بھی زیادہ بے آرام کرنے والا ہے۔

ابر آذراست و من بستان او
تاکِ من نمناک از بارانِ او

☆☆☆☆

ابر رحمت سے مرا سیراب گلشن ہوگیا
اور مئے الفت میں تر اب میرا دامن ہوگیا

علامہ اقبالؔ اپنے کلام میں حضرت محمدؐ سے محبت و عقیدت کا اظہار تسلسل سے کرتے ہیں۔ ہر بار وہ ایک نئے انداز اور نئی مثالوں سے اس کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کے ہر پہلو کو آپؐ ہی کی ذات سے منسلک سمجھتے ہیں۔ اس شعر میں بھی اسی عقیدت کا اظہار کیا ہے کہ حضورؐ کی ذات میرے لیے ابر رحمت کا درجہ رکھتی ہے جس کا نور ہدایت میرے دل کے چمن پر برستا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرے دل بلکہ پورے وجود میں بہار آ جاتی ہے اور میرے خیالات نشو و نما پاتے ہیں جن کا اظہار میں اس طرح کرتا ہوں کہ وہ سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ اس کا منبع اور سر چشمہ آپ ہی کی ذات ہے۔

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیم
نظم و نثر او علاجِ خامیم

☆☆☆☆

پیش کرتا ہوں میں جامی کو عقیدت کا خراج
جن کی نظم و نثر ہے میرے عوارض کا علاج

اقبالؔ نہ صرف عاشق رسولؐ تھے بلکہ وہ ہر اس شخص سے محبت رکھتے تھے جو رسولؐ اللہ کا عاشق ہو، فارسی کے عظیم ایرانی شاعر عبدالرحمٰن جامی جنہوں نے بے شمار نعتیں لکھی ہیں عاشقان رسولؐ کے لیے اکثیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ نہ صرف نعتیں بلکہ جامیؔ نے نثر میں اس حوالے سے بڑا اہم ذخیرہ چھوڑا ہے، اسی لیے اقبالؔ ان سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے جامیؔ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ملا جامیؔ کا انداز ایسا ہے کہ اس کا مقابلہ کسی دوسرے شاعر سے نہیں کیا جا سکتا، اسی لیی انہوں نے حضورؐ کی شان میں نظم و نثر میں جو کچھ لکھا وہ ہم جیسے عاشقان رسولؐ کے لیے علاج کی حیثیت رکھتا ہے۔

شعر لب ریز بمعانی گفتہ ام
در ثنائے خواجہ گوہر سفتہ ام

☆☆☆☆

پُر معنی سے بھرے اشعار ہیں
شعر کیا ہیں موتیوں کے ہار ہیں

سرسری طور پر بھی غور کرنے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ جتنا کچھ حضرت محمدؐ کی شان میں کہا گیا یا نظم و نثر میں لکھا گیا ہے اتنا شاید ہی کسی ہستی کے بارے میں ملے گا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے مگر اس کے باوجود ایسے چند ہی ہوں گے جن کے کلام کو حیات دوام ملی ہے۔ اقبالؔ یقیناً ان میں سے ایک ہیں کیونکہ ان کے اشعار کا انداز اور معنی دونوں دوسروں کے مقابلے میں منفرد ہیں، اسی امر کا بیان اقبالؔ نے اس شعر میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔ میں نے حضورؐ کی شان میں ایسے پُر معنی الفاظ میں اظہار کیا ہے جیسے کسی لڑی میں موتی پرو دیے گئے ہوں۔

نسخہ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

☆☆☆★

ابتدائے دہر بیشک آپؐ ہی کی ذات ہے
ہم تو بندے ہیں فقط سردار ان کی ذات ہے

یہ شعر دراصل علامہ اقبالؔ کا نہیں بلکہ دراصل یہ مولانا جامیؔ کا ہے اور کیونکہ علامہ اس کے معنی و مفہوم سے مکمل اتفاق کرتے ہیں اور انہی کے جذبات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے اس لیے آپ نے اسے اپنی نظم میں شامل کر لیا ہے۔ شعر میں اس حدیث کا ذکر ہے جس میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ''سب سے پہلے خدا نے میرے نور کو پیدا کیا'' یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ جب اس کائنات میں کسی شے کا وجود ہی نہیں تھا۔ نہ سورج، چاند ستارے اور دیگر سیارے وجود میں آئے تو حضرت محمدؐ کا نور وجود میں آ چکا تھا، اسی کو اس طرح یہاں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کی ذات کائنات کی کتاب کا دیباچہ ہے اور باقی سب بندگان ہیں سردار صرف ان کی ذات ہے۔

شکوہ سنج سختی آئیں مشو
از حدود مصطفیٰ بیروں مرو
☆☆☆☆
کچھ شریعت کا گلہ اچھا نہیں
طاعت خیرالورا بیجا نہیں

اسلام میں تمام انسانوں کے لیے ایسے اصول بنائے گئے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو نہ صرف انفرادی طور پر ہر ایک کی بھلائی ہے بلکہ اس میں اجتماعی فلاح کا راز پنہاں ہے، اسی لیے ہر مسلمان کو ان پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تا کہ ہر ایک انسانیت کے لیے کردار کی اعلیٰ ترین درجہ کی مثال بن جائے۔ ان میں سب سے اہم خدا کی مکمل اطاعت ہے، اگر اس پر مکمل یقین کے ساتھ کاربند ہوا جائے تو کسی قسم کی پابندی بھی مشکل نہیں لگے گی اور ہر قسم کی پابندی کا نہ کوئی شکوہ ہوگا نہ شکایت لیکن اس کے برخلاف رویہ سے سوائے گمراہی اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے اس شعر میں یہی بیان کیا ہے۔

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
☆☆☆☆
شہسوارِ مرکب دوراں خدارا آیئے
اے فروغ دیدۂ امکاں مدد فرمایئے

اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ گزشتہ کئی صدیوں سے اقوام عالم میں مسلمان بطور امت پستی کا شکار ہیں۔ کہیں وہ جسمانی غلام ہیں تو کہیں ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، اسی لیے دنیا میں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں جبکہ دیگر اقوام اپنے علم و محنت کی بدولت پوری دنیا کو اپنے قابو میں کیے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی فکر کا بنیادی پیغام یہی ہے کہ مسلمان اس پستی سے نکل کر ایک باعزت مقام حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس صورتحال سے مایوس ہو کر وہ رسول اللہؐ سے التجا کر رہے ہیں کہ وقت کے گھوڑے کے سوار آج ہمیں آپؐ کی پھر ضرورت ہے، پس جلد نزول فرمایئے کیونکہ آپؐ قدرت کی آنکھ کا تارا ہیں جو ہماری مشکل کو حل کر سکتا ہے۔

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوار دیدہ با آباد شو
☆☆☆☆
رونق بزمِ دو عالم پھر دوبالا کیجیے
یا رسولؐ اللہ آنکھوں میں اُجالا کیجیے

علامہ اقبالؔ مسلمانوں کی ذات سے پریشان اور فکر مند رہتے تھے کیونکہ اقوام عالم میں امت مسلمہ وہ مقام جو اسے ماضی میں حاصل تھا برقرار نہ رکھ سکی تھی اور پستی میں ڈوبی ہوئی تھی، اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے اس حالت کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی آگے بڑھنے کی تحریک تھی کیونکہ ان کی رہنمائی کرنے والی کوئی ہستی دنیا میں موجود نہیں تھی۔ اس صورت حال پر اقبالؔ کی یہ خواہش کہ حضرت محمدؐ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں اسی لیے وہ شعر میں التجا کر رہے ہیں کہ آپؐ آئیں تا کہ مسلمانوں میں ہنگامہ خیز رونق پیدا ہوجائے اور وہ ترقی کی جدوجہد کرنے لگیں اور امت کی آنکھیں آپؐ کے نور سے روشن ہوجائیں۔ یہی پستی سے باہر آنے کی صورت ہے۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں رابدہ پیغامِ صلح
☆☆☆☆
جنگ خواہوں کیلیے پیغام الفت لایئے
آیئے صلح کراکے امن کو پھیلایئے

انسانی تاریخ جنگ و جدل کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ شاید تاریخ دراصل جنگ کے واقعات پر ہی مبنی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ ان جنگوں میں لاکھوں انسانوں کی جان لی گئی لیکن جہاں ایک جانب جنگجو تھے تو دوسری طرف ایسی ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جو اخوت و بھائی چارے اور امن و امان کا درس دیتی رہیں، ان میں سب سے نمایاں نام حضرت محمدؐ کا ہے، اسی لیے اقبالؔ کی یہ خواہش ہے کہ آپؐ اس دنیا میں تشریف لائیں اور اختلافات اور جنگوں میں مبتلا لوگوں کے درمیان امن و صلح کرائیں تا کہ دنیا کا ماحول پُرسکون ہو کیونکہ اسلام کا پیغام یہی ہے جس پر عمل کر کے یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نوعِ انسان مزرع و تو حاصلے
کاروانِ زندگی را منزلے

☆☆☆☆

جو ہے انساں کی ذراعت اس کا حاصل آپ ہیں
زندگی کے کارواں کی صرف منزل آپ ہیں

تخلیق آدم اور دنیا کو آباد کرنے کے بعد خدا نے آدمی کو درس انسانیت اور رہنمائی کے لیے ابتدا سے ہی ایسی ہستیاں زمین پر اتاریں جو یہ فرض پورا کریں تاکہ یہاں ایک بہتر معاشرہ قائم ہو۔ یہ نبی اور رسولوں کی ہستیاں تھیں جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ ان میں آخری ذات حضرت محمدؐ کی ہے۔ دیگر بے شمار افراد کی طرح علامہ اقبال بھی آپؐ سے اپنے انداز پر اظہارِ محبت وعقیدت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ بیان کررہے ہیں کہ اگر انسان کو کھیتی کرنے والا کسان تصور کرلیا جائے تو آپؐ کی ذات اس کی محبت ومشقت کا حاصل ہے کیونکہ انسانی قافلے کے سفر کی منزل یا عروج آپ کی ہستی اور اس کا دیا ہوا پیغام ہے۔

ریخت از جورِ خزاں برگ شجر
چوں بہاراں بر ریاض ما گزر

☆☆☆☆

ہے خزاں سے گلشن اسلام گویا سوگوار
آپ کی آمد سے اس گلشن میں آجائے بہار

علامہ اقبال کی شاعری اور فکر کا بنیادی نکتہ مسلمانوں کو اقوام عالم میں ایک اعلیٰ مقام اور باعزت زندگی کا حصول ہے کیونکہ گزشتہ کئی صدیوں سے ان کی حالت اس کے برخلاف ہے۔ وہ علمی میدان میں پستی میں ہیں، عمل کی قوت ان میں پائی نہیں جاتی، آگے بڑھنے کی خواہش نہیں ہے جس کی وجہ سے دیگر اقوام ان پر غلبہ حاصل کرلیتی ہیں اور وہ ان کے دستگیر ہیں، اس تباہی اور بربادی سے نجات کا ایک ہی ذریعہ ہے وہ ہے اسلام کے اصولوں پر حقیقی معنی میں عمل کرنا، اسی کا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا ہے کہ اس وقت گلشن اسلام پر خزاں طاری ہے اور اس سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے وہ صرف حضرت محمدؐ کی پیروی کی جائے اور ان کی ہدایت کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزاری جائے۔

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارے ما بگیر

☆☆☆☆

آپؐ کے قدموں پہ سر رکھنے کو ہیں بیتاب سب
ہم گنہگاروں کی سُن لیں التجا شاہ عرب

مسلمانوں کے عقیدے کے جو بنیادی ستون ہیں ان میں خدا وحدانیت کا اقرار کے بعد حضرت محمدؐ کے آخری نبی ہونے کا یقین ہے، اسی لیے اس دنیا میں پیدا ہونی والی کسی بھی شخصیت کے مقابلے میں ہمیں آپؐ کی ذات سے محبت و عقیدت ہوتی ہے جس کے مطابق ہمیں ان اصولوں کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے جن کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے لیکن عملاً ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ دنیاوی و مادی حرص وہوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے شرمساری ہوتی ہے۔ اسی کیفیت کو اقبالؔ نے بیان کیا ہے کہ امت کا کمسن ہو یا جوان و بوڑھا وہ اپنے کیے پر شرمسار ہے اور اس کی تلافی کے لیے بے چین ہے کہ آپؐ کے قدموں پر سجدہ کر کے معافی مانگے۔

از وجودِ تو سر افرازیم ما
پس بہ سوزایں جہاں سوزیم ما

☆☆☆☆

آپؐ کے صدقے میں ہوتی ہیں دعائیں سب قبول
آپؐ ہی کے عشق میں ہے کامیابی کا حصول

بنی نوع انسان کے لیے عموماً اور امت مسلم کے لیے خصوصاً کامیابی اور عزت کا مقام حاصل کرنے کا واحد راستہ حضرت محمدؐ سے محبت کرنا اور ان کی ہدایت اور بنائے ہوئے راستے کے مطابق اپنی زندگی گزارنا ہے۔ ان میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا قیام، حصول علم کے ذریعے کائنات کے سربستہ رازوں کو افشاں کرنا اور انسانیت کی خدمت کرنا ہیں لیکن یہ بے لوث جذبہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم سیرت نبیؐ پر کاربند ہوں تا کہ دنیاوی و مادی خواہشات نفسانی سے دور ہو سکیں، اسی لیی اس شعر میں اقبالؔ نے کہا ہے کہ حضرت محمدؐ کا وجودانؐ سے عشق کا سوز، سرفراز و کامیابی کا باعث ہے۔

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست
اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

☆☆☆☆

معرفت حق کی شریعت کے بنا ممکن نہیں
اصل سنت تیری الفت کے بنا ممکن نہیں

علامہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں جس امر کا مستقل ذکر کیا ہے وہ حضرت محمدؐ سے محبت اور ان کی پیروی کرنا ہے جس کے بغیر کسی علم کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ کی سنت پر عمل کرنا ہی دراصل خدا کی ہدایت اور اسلام کے اصول کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا اس کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ آپ کی حیات طیبہ تمام انسانوں کے لیے کردار وعمل کا ایسا عملی نمونہ ہے جس پر عمل کر کے ہی کوئی آدمی انسانیت کے درجہ پر فائز ہو سکتا ہے، اسی لیے اس شعر میں کہا گیا ہے کہ کوئی علم جو شریعت کے مطابق نہیں وہ بے مقصد ہے اور اصل سنت وہ ہے کہ آپ کی ذات سے محبت کی جائے اور اس پر عمل ہو۔

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات
شرع او تفسیر آئینِ حیات

☆☆☆☆☆

مصطفیٰ کا دین ہے دینِ حیات
زندگی ان کی ہے آئینِ حیات

تخلیق آدم سے لے کر حضرت محمد کی اس دنیا میں آمد تک خدا کی جانب سے مختلف ادوار میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے رسول اور نبی آتے رہے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اس میں تحریف کر دی جس کی وجہ سے اس کا پیغام اپنی اصلی شکل میں نہ رہا اور آخر خدا نے اپنے آخری نبی کو دنیا میں بھیجا جو خدا کا حقیقی پیغام لے کر آئے جس میں تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی اور یہ مکمل دین ہے اور انسانیت کی بھلائی صرف اس میں ہے کہ وہ اسے قبول کرے اور اس کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرے، اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یہاں بیان کیا ہے کہ دین مصطفیٰؐ ہی اصل دین ہے اور آپ کی حیات طیبہ اس کی عملی تفسیر ہے۔

از پیامِ مصطفیؐ آگاہ شو
فارغ از ارباب دوں اللہ شو

☆☆☆☆

بس پیام مصطفیؐ کو جاں لے
لا الٰہ کہہ اور رب کو مان لے

کسی نظریہ پر یقین کرنے اور اس کے مطابق زندگی میں عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم کے بنیادی نکات سے واقفیت ہو کیونکہ اس کے بغیر اس کو سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی کلیہ مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے، اسی لیے خدا اور اس کے آخری نبیؐ نے اپنے پیروکاروں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے دین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں بلکہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نبیؐ کی زندگی کا مطالعہ کریں جو دین کا عملی اظہار ہیں۔ یہی نکتہ یہاں بیان کیا ہے کہ ہر مسلمان کو حضرت محمدؐ کے پیغام سے آگاہی ہونی چاہیے تا کہ وہ دنیاوی حرص وہوس سے فارغ ہو کر صرف اللہ کی جانب مائل ہو جائے۔

ہر کہ عشق مصطفیؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ داماں اوست

☆☆☆☆

جو بھی عشقِ مصطفیؐ پاجائے گا
خشک و تر قبضے میں خود آجائے گا

ہر مسلماں کے ایمان کی منزل عشق محمد مصطفیؐ ہے کیونکہ یہی وہ راہ ہے جو اسے خدا تک پہنچاتی ہے اور اس کے بغیر اس کا عقیدہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا، وہ اس عشق کی جس منزل سے گزرتا جائے گا اتنا ہی اس کا ایمان مکمل ہوتا جائے گا جس کے معنی ہیں کہ وہ کردار کے اس درجہ پر فائز ہو جائے جہاں اس کے لیے دنیا بازیچہ اطفال کی حیثیت اختیار کر جائے گی جس کی اس کے جذبہ عشق کے سامنے کوئی قدر نہیں ہوگی اور دنیا کی کوئی شے یا مقام اس کے ایمان کو کمزور نہیں کر سکے گا۔ بقول اقبالؔ جس کی کل کائنات عشق رسولؐ ہو وہ دنیا کا محکوم نہیں ہو سکتا بلکہ دنیا کی ہر شے اس کی محکوم ہو جاتی ہے۔

رانکہ ملت را حیات از عشق اوست
برگ وسازِ کائنات از عشق اوست

☆☆☆☆

زندگی امت کی ہے بس عشق احمدؐ کے طفیل
رونقیں دنیا کی ہیں بیشک محمدؐ کے طفیل

امت مسلماں کواگر قابل عزت واحترام مقام حاصل کرنا ہےتو اس کے لیےضروری ہے کہ وہ خدا کے رسول حضرت محمدؐ سے محبت وعقیدت رکھے، نہ صرف زبانی طور پر بلکہ عملاً بھی ان کی پیروی کرے جس سے وہ ایک قابل تقلید مقام حاصل کرلے گی، موجودہ پستی سے باہر آنے کا یہی نسخہ ہے، اسی جانب علامہ اقبالؔ نے اشارہ کیا ہے کہ اگرملت اسلامیہ کواقوام عالم میں اپناوقار قائم کرنا ہےتو اس کے لیےضروری ہے کہ وہ سچے جذبہ کے ساتھ رسولؐ اللہ سے حقیقی عشق کرے اوراس کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے اوراگر یہ جذبہ حاصل کرلیاتو اس کے لیے دنیا کی رونق کے دروازے کھل جائیں گے۔

تب وتابِ بت کدۂ عجم نرسد بسوز و گدازِ من
کہ بیک نگاہ محمدؐ عربی گرفت حجازِ من

☆☆☆☆

عجم کے بت کدوں کی شان وشوکت سے نہیں حیراں
محمد کی نگاہوں کا مرے دل پر ہے بس احساں

اگرایک سچا مسلمان حقیقی معنی میں رسولؐ اللہ کا عاشق ہوتو اس کوکوئی مادی شے متاثرنہیں کرسکتی، خواہ وہ کتنی ہی شانداراور عالیشان کیوں نہ ہو، اس لیے کہ وہ فانی اشیاء کے مقابلے میں کردار کی بلندی اور ایمان کی صداقت پر یقین رکھتا ہے جس میں کوئی شخصیت حضورؐ کی ذات سے بلند ہو ہی نہیں سکتی، اسی لیے اقبالؔ کہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی مادی شے میری نظر میں بلندو بالانہیں ہوسکتی۔ نہ عجم کے بت کدے میرے لیے کسی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ میں محمد عربیؐ کی ایک نظر کرم کی گرفت میں گرفتار ہوں جس کے نور کے سامنے ہر مادی شے کمتر اورتاریک ہے۔

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نواخواں از سُرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِشام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

☆☆☆☆

ہوں پیری میں رواں میں سوئے یثرب
لبوں پر نغمہ میرے عاشقانہ
مری حالت ہے اس طائر کے مانند
کہ شام ہوتے ہی فکرِ آشیانہ

ہر وہ انسان جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ عاشق رسولؐ نہ ہو اور وہ دنیا میں کسی بھی جگہ جانے کے مقابلے میں ان مقامات کو ترجیح دے گا جہاں خانہ خدا اور روضہ رسولؐ ہوگا، اسی لیے لاکھوں افراد مکہ و مدینہ کا سفر سال کے بارہ مہینے کرتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد مکہ جائے اور مدینہ کا سفر نہ کرے کیونکہ اس کے بغیر اس کی زیارت مکمل نہیں ہوسکتی۔ عمر کی ساتھ ساتھ زندگی کے دن کیونکہ کم رہ جاتے ہیں اس سفر کی خواہش شدت اختیار کر جاتی ہے۔ ایسے میں اقبالؔ جیسا عاشق رسولؐ کیسے مبرا ہوسکتا تھا لیکن کیونکہ زندگی میں انہیں یہ موقع نہ مل سکا، اس لیے یہ حسرت ہی کرتے رہے لیکن خیالات اور تصور میں وہ ہر لمحہ انہی مقدس مقامات پر ہوتے جس کا اظہار انہوں نے اس رباعی میں کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں عمر کے آخری حصہ میں ہوں مگر میں پھر مدینہ میں حاضری دینے کی حسرت میں گرفتار ہوں اور ہر وقت حضورؐ کی نغمہ خوانی کے سرور عاشقانہ سے سرشار رہتا ہوں اور میری حالت ایسی ہوتی ہے جیسے سرِشام صحرا کے پرندے اپنے آشیانے کی تلاش میں فکر مند ادھر سے ادھر پرواز کرتے رہتے ہیں۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

☆☆☆☆

آ ہم نفس کہ مل کے کریں آہ و زاری یوں
حالت ولا نے جن کی بنائی ہماری یوں
اللہ سے دعا ہے مدینہ بلا لے وہ
سرخاک پر ہو ان کی اور ہو عمر گزاری یوں

یہ عام مشاہدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح سے اپنے محبوب کے قریب ہو جائے اور اس کا دیدار کرتا رہے، خواہ اس کے لیے اسے کسی بھی تکلیف سے گزرنا پڑے تا کہ اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو راحت نصیب ہو اور جب یہ عشق کسی ایسی ہستی سے ہو جو محبوب الٰہی ہو۔ جس کو خدا نے اپنا خاص بندہ قرار دیا ہو، انسانیت اور عالمین کے لیے رحمت قرار دیا ہو تو اس میں عقیدت کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے، اس لیے اس کا دیدار کرنے اور عقیدت کا اظہار کرنے کی خواہش دو بالا ہو جاتی ہے، اسی کیفیت کو اقبالؔ نے اس رباعی میں بیان کیا ہے، وہ اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب ہیں کہ میں اور تو رسولؐ اللہ سے عشق کی ایک ہی منزل پر ہیں اور اس امر کے متمنی ہیں کہ اپنے محبوب کے حسن و جمال کا دیدار کریں، اس لیے آ تا کہ ہم دونوں فراق رسولؐ میں دل کی گہرائیوں سے یہ درخواست کریں کہ وہ ہمیں یہ توفیق عطا کریں کہ ہم ان کے قریب آ سکیں اور ان کے قدموں میں اپنی آنکھوں کو سجدہ ریز کریں تا کہ ان میں آپؐ کے نور کی روشنی پیدا ہو اور ہمارے دل کو قرار آئے، یہ صرف دو حرفی مراد ہے جس کی قبولیت ہی ہمارا مقصد ہے۔

بمنزل کوش مانند مہ نو
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دَیر
بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رد

☆☆☆☆

مہ نو کی طرح پا جائے منزل
اور ایک دن چمکے بن کر ماہِ کامل
محمدؐ سے محبت کرکے دیکھو
کہ دنیا وار عقبیٰ کی خوشی بھی ہو گی حاصل

اگر تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت باآسانی سامنے آجائے گی کہ گزشتہ صدیوں سے امت مسلمہ دیگر اقوام کے مقابلے میں پستی کا شکار ہے، نہ اس میں علم کی جستجو ہے نہ تحقیقات کا جذبہ، ایسی دیگر اقوام سائنسی، معاشی، تہذیبی ہر لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں جس کی وجہ سے مسلمان نہ صرف مادی اعتبار سے ان کے دست نگر بلکہ دینی طور پر بھی ان کے غلام ہیں، اسی لیے وہ اپنی شناخت سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفہ کا محور ایسی صورت حال ہیں اسی لیے وہ وہ نہ صرف مسلمانوں کو ان کی اس حالت سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس سے نجات کا طریقہ بتاتے ہوئے رہنمائی بھی کرتے ہیں جو ان کے خیال میں صرف وہ راستہ ہے جو ہمیں اسلام بتاتا ہے اور اس کا عملی نمونہ حضرت محمدؐ کی ذات اور ان کی سنت ہے جس کی وہ مختلف مثالیں دیتے ہیں۔ اس شعر میں بھی وہ یہی بیان کرتے ہیں کہ ہمیں چاند کے عروج وزوال سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ وہ ہر ماہ کے ابتدائی دنوں میں اتنا باریک ہوتا ہے کہ اس کا نظر آنا بھی محال ہوتا ہے مگر ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کی جسامت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورا مہتاب بن جاتا ہے، اسی طرح سے مسلمانوں کو بھی حضورؐ کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل کرنا چاہیے تاکہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے دنیا میں اپنا مقام حاصل کرسکیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

☆☆☆☆

محبت مصطفیٰ سے کر، مکمل دین ہے وہ
کوئی اور راستہ بولہب کا آئین ہے وہ

مسلمانوں کے دین یعنی اسلام کی بنیاد حضرت محمدؐ کی معرفت کا حاصل ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی بھی حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا، اسی کلمہ میں خدا کی وحدانیت کے اقرار کے بعد جس امر کا یقین کرنا ہوتا ہے وہ حضورؐ کے آخری نبی کے ہونے کا ہے جن کا خدا کی طرح نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہی کوئی وارث۔ اس حقیقت کا اظہار اقبالؔ اپنے کلام کی تکرار سے کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ اسی نکتہ کو بیان کر رہے ہیں کہ حضرت محمدؐ کی ذات اور ان کی سنت ہی اسلام کا مرکز ہے، اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کی تقلید کرے ورنہ وہ کتنی ہی عبادت کر لے اس کو منزل نہیں مل سکتی کیونکہ اس کے علاوہ باقی سب بولہبی ہے۔

در بیان مرتضیٰؑ

خاکم از مہر او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا درسینہ ام

☆☆☆☆

ان کی اک نظرِ کرم نے مجھ کو آئینہ کیا
اور ان کے نور نے روشن مرا سینہ کیا

انسان کی تخلیق خاک سے ہوئی اور اس کا انجام بھی مٹی میں ہی ہوتا ہے اس لیے اس کو خاکی کہا جاتا ہے لیکن جب خاکی انسان علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے اور کسی ایسی ہستی سے عشق کرنے لگتا ہے جو مینارِ علم ہو تو اس کا جسم محبوب کے نور سے روشن ہو کر اس کا دل و دماغ آئینے کی طرح بے داغ ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اقبالؔ کی بھی ہے، انہوں نے اپنے آپ کو حضرت علیؓ کی شخصیت سے اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ ان کے سامنے علم کے دروازے کھل گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ خاکی کا سینہ علم و عمل کی سورج کی روشنی سے اس طرح روشن اور صاف ہو گیا ہے جیسے کوئی بے داغ آئینہ ہو جس میں علم کے خزانے نظر آتے ہوں۔

از رخِ او خال پیغمبر گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت

☆☆☆☆

خوش ہوئے پیغمبرِ دیں جس کا چہرہ دیکھ کر
مطمئن تھی ساری ملت جن کا جذبہ دیکھ کر

اقبالؔ نے حضرت علیؓ کی ذات کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جس کو بیان کر کے انہوں نے اپنی عقیدت کا اظہار نہ کیا ہو۔ خواہ آپؓ کی پیدائش کا واقعہ ہو جس کے مطابق ان کی پیدائش خانہ کعبہ میں ہوئی اور پہلی ہستی جس نے انہیں اپنی آغوش میں لیا وہ سرورِ کائنات کی تھی۔ آپؓ کا نام علی بھی آپ کی تجویز پر رکھا گیا جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ ان کی پرورش حضورؐ کے زیرِ سایہ ہوئی، اسی کی بدولت خدا

کے پیغام کو پھیلانے اور اس کی حفاظت کے لیے حضرت علیؑ نے کسی بھی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کیا اور آخری وقت تک یہ فرض پورا کرتے رہے، یہاں یہی بیان کیا گیا ہے۔

قوت دین ہیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

☆☆☆☆

قوتِ دین نبی تھے آپ سب کو یاد ہے
وجہِ استحکام مولا آپ کی اولاد ہے

اسلامی تاریخ کے ابتدائی سالوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بہت مشکل صورت حال تھی مکہ کے سارے قبائل پیغام حق کے خلاف یک زباں تھے اور جو چند افراد اس پیغام پر لبیک کہتے ان پر ظلم جبر کے پہاڑ ٹوٹتے تھے۔ ہجرت کے بعد بھی اس رویے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بذریعہ طاقت اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے والوں میں حضرت علیؑ کی ذات پیش پیش تھی اور جنگوں میں فتح آپؑ ہی کی قوت اور بہادری کا نتیجہ تھی، اسی لیے اقبالؔ نے نہ صرف آپؑ کو دین کی قوت قرار دیا بلکہ مستقبل میں بھی اسلام کے فروغ اور حق کے قیام کا ذمہ دار بھی اولادِ علیؑ کو سمجھتے ہیں۔

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در ام الکتاب

☆☆☆☆

مصطفیؐ نے پیار سے تم کو کہا ہے بوتراب
اور یداللہ کہہ رہی ہے آپ کو حق کی کتاب

حضرت علیؑ کو مختلف القابات سے یاد کیا جاتا ہے جن میں سے ایک بوتراب بھی ہے جو خود رسولؐ اللہ نے انہیں عطا کیا تھا کیونکہ ایک دن حضرت محمدؐ ان کی تلاش میں تھے تو معلوم ہوا کہ وہ مسجد میں زمین پر آرام کر رہے ہیں، آپؐ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت علیؑ سو رہے ہیں اور آپؑ

کی پوشاک گرد آلود ہو رہی ہے جسے صاف کرنے کے بعد آپؑ نے مخاطب ہو کر کہا۔ بوتراب اٹھو، جب سے یہ لقب عام ہو گیا۔ دوسرا لقب آپؑ کا یداللہ ہے، یعنی اللہ کا ہاتھ، جس نے نظریہ اسلام اور رسولؐ اللہ کی حفاظت کی۔ انہی دونوں القاب کی جانب اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مرسل حقؐ نے آپ کو بوتراب کا نام دیا اور یداللہ کا تذکرہ ام الکتاب یعنی قرآن پاک میں موجود ہے۔

ہر کہ دانائے رموز زند گیست
سِرِّ اسمائے علی دانہ کہ چیست

☆☆☆☆

جس نے سمجھے ہیں رموز زندگی
اس کو حاصل ہے علی کی بندگی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو صرف عبادت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے جن کا مقصد انسان کے اخلاق و کردار کی تعمیر ہو اور ایک بہتر معاشرہ وجود میں آئے، عبادت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان خدا کے احکامات کو یاد رکھے جو اس کے دیے ہوئے ہیں اور ایسی ہستیاں پیدا کیں جو ان کا عملی نمونہ ہیں، ان میں اولین نام حضرت علیؑ کا آتا ہے کیونکہ آپؑ کی زندگی خدا کے بنائے ہوئے اصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اسی لیے اقبالؔ کا خیال ہے کہ آپؑ کی شخصیت کا ادراک صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو اسرار و رموز زندگی سے واقف ہو اور جس کے ناموں میں پوشیدہ رازوں تک پہنچنا کسی عام آدمی کی دسترس سے بلند تر ہے۔

خاک تاریکے کہ نام او تن است
عقل از بیدادِ او درشیون است

☆☆☆☆

جسم مٹی کا ہے یوں اس کی کوئی وقعت نہیں
عقل بھی اس واسطے دیتی ہے اہمیت نہیں

آدمی کے جسم کی تخلیق مٹی، پانی اور آگ سے کی گئی اور اس میں روح ڈالی گئی، اس کا نفس پیدا

کیا گیا جو آدمی کو دنیاوی و مادی حرص و ہوس میں مبتلا کرتا ہے جو معاشرے کی اصل خرابیوں کی وجہ ہے کیونکہ جب روح جسمانی ضروریات پر غالب آ جاتی ہے تو آدمی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی انسانیت پس پشت چلی جاتی ہے اور اس کا کردار پستی میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی لیے صاحب کردار افراد کے لیے خاکی جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ اصل اس کی روح کی پاکیزگی اور آدمی کا کردار ہوتا ہے جو حق و صداقت کا اصل پیمانہ ہے جو خدا کا اصل پیغام ہے۔

فکر گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کورو گوش ناشنوا ازو

☆☆☆☆

یہ خیالوں کی بلندی کو ملا دے آن میں
دھول جھونکے آنکھ میں اور کان میں

انسانی کردار کی بلندی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ اپنی جسمانی اور مادی خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی خواہشات کا غلام ہو جائے جن کی کوئی انتہا نہیں ہے تو اس میں نیک و بد کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا نفس کسی انتہا کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتا جس کی وجہ سے نہ برائی دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی وہ نیکی کی کوئی ہدایت سن پاتا ہے۔ ہم میں جو افراد معاشرے میں برائیوں کا ادراک رکھتے ہیں اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں ان برائیوں کا احساس بھی ہے اور ان کو نظر بھی آتی ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں اور کان کھلے ہیں۔

ازہوس تیغ دو رو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست

☆☆☆☆

بس ہوس کی تیغ دو رویہ ہی جس کے پاس ہے
یوں سمجھئے رہروں کا اس سے ستیاناس ہے

آدمی کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے جو اسے مادّی حرص و ہوس میں مبتلا کر کے انسانیت سے دور کرتا ہے، وہ راہِ حق سے دور ہوتا جاتا ہے اور اخلاقی پستی کی کھائیوں میں گرتا جاتا ہے، یہ رویہ اگر اجتماعی ہو جائے تو پورا معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے جس کا مشاہدہ آج کل ہر جانب کیا جا سکتا ہے کہ ہم اصل مقصد حیات سے غافل ہو کر خود غرضی میں مبتلا ہو چکے ہیں، اسی لیے اقبالؔ نے نفس کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہوس دنیا کی دو دھاری تلوار ہوتی ہے جو دونوں جانب سے ہلاکت خیز ہوتی ہے، اس لیے اس کا ساتھ دینے والے مسافر کسی طرح بھی محفوظ نہیں ہوتے۔

شیر حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گل تاریک را اکسیر کرد

☆☆☆☆

جو کہ اپنی ذات کو تسخیر کر ڈالے وہی
گویا اپنی خاک کو اکسیر کر ڈالے وہی

جو انسان نفس کا غلام ہو جاتا ہے وہ راہِ حق سے بھٹکا ہوا ہوتا ہے اور صرف خاک کا پتلا رہ جاتا ہے، ایسے ہی افراد کی رہنمائی کے لیے خدا ایسی ہستیوں کو اس جہاں میں بھیجتا ہے جو نہ صرف انسانوں کی رہنمائی کریں بلکہ ان کے لیے عملی نمونہ بھی ہوں تا کہ ان کی تقلید کی جائے۔ ایسی شخصیات میں حضرت علیؑ ایک نمایاں مقام کے حامل ہیں، اس لیے علامہ اقبالؔ ان کی مثال ہر موقع پر بیان کرتے ہیں، یہاں بھی حضرت علیؑ کی مثال دے رہے ہیں کہ کس طرح انہوں نے اپنے نفس کو خدا کے حوالے کر کے جسمانی اور مادی خواہشات کو تسخیر کیا اور ایسی مثال قائم کی کہ خاک کی تاسیر دنیا کے لیے اکسیر بنا دی۔

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بو تراب از فتح اقلیم تن است

☆☆☆☆☆

مرتضیٰ کی تیغ سے دنیا میں نورِ حق روشن
بو تراب اس واسطے کہ سر ہوئی اقلیم تن

تاریخ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ فروغ دین کے ابتدائی مرحلوں میں کتنے مشکل حالات تھے، مخالفتیں اپنے عروج پر تھیں اور سازشوں کا جال بنا ہوا تھا، ایسے میں حضرت علیؑ کی ذات تھی جو ہر مشکل وقت میں نصرت کے لیے موجود تھی۔ ابتدائی جنگوں میں جب مسلمانوں کی تعداد محدود تھی آپؑ سب سے اگلی صفوں میں موجود ہوتے اور مخالفین کے نامور جنگجوؤں کو شکست دیتے جس میں ان کی کسی نفسانی خواہش کا دخل نہیں ہوتا۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے کہ مرتضٰی کی تیغ سے دنیا حق کے نور سے روشن ہوئی، اسی لیے آپؑ کو مرتضٰی کہا گیا۔ یعنی منتخب اور پسندیدہ اور کیونکہ آپؑ نے اپنے نفس اور مادّی خواہشات کو اس طرح قابو کرلیا تھا کہ ان کا وجود نہ رہا تھا اس لیے آپ کو بوتراب کا خطاب ملا۔

مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است

☆☆☆☆

فاتح خیبر بھی ہیں اور آپ ہی کرار ہیں
آپؑ کے کردار کی عظمت ہے کہ خوددار ہیں

علامہ اقبالؔ نے یہاں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے آپؑ کے کردار کا تذکرہ کیا ہے۔ ان صفات میں آپؑ کی بہادری اور خودداری کا ذکر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہاں جنگ خیبر کا حوالہ ہے، خیبر اہل یہود کا ناقابل تسخیر قلعہ تھا۔ لشکر اسلام نے اس کی فتح کی کئی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے تو حضرت محمدؐ نے اعلان کیا کہ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جو ناکام واپس نہیں آئے گا اور آپؐ نے حضرت علیؑ کو علم دیا جو کامیاب آئے اور کرار کا لقب پایا، اسی لیے اقبالؔ نے کہا کہ فتح صرف بہادری سے ہی حاصل کیجا سکتی ہے جو ایک خوددار شخص میں ہی ہوتی ہے، اسی لیے حضرت علیؑ کی ذات ان دونوں خصوصیات کا فخر وافتخار ہے۔

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرد اندز مغرب آفتاب

☆☆☆☆

مصطفٰی جس کو پکاریں بوتراب
وہ ہی مغرب سے پلٹ دے آفتاب

حضرت علیؑ کے حوالے سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ دوران سفر آنحضرتؐ آپ کے زانوں پر سر رکھ کر سو رہے تھے، اسی دوران عصر کی نماز کا وقت ہو گیا لیکن آپؐ بیدار نہ ہوئے۔ جب آنکھ کھلی تو حضرت علیؑ نے عصر کا وقت گزر جانے اور سورج کے غروب ہونے کا بتایا تو حضرت محمدؐ نے ان سے کہا کہ دعا کرو کہ سورج دوبارہ طلوع ہو جائے اور نماز ادا کی جائے۔ خدا کی قدرت سے ایسا ہی ہوا، اسی واقعہ کو اقبالؔ نے یہاں نظم کیا ہے۔ جس ہستی کو کائنات کی منتخب ترین ہستی بوتراب کے لقب سے پکارے اسی میں یہ قوت ہو سکتی ہے کہ وہ زمین کو حکم کرے کہ وہ پلٹ جائے اور سورج ڈوبنے کے باوجود دوبارہ نظر آنے لگے، وہ صرف حضرت علیؑ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔

هر که زین برمرکب تن تنگ بست
جوں نگیں۔ برخاتمِ دولت نشست

☆☆☆☆☆

وہ جو اپنے نفس پر غالب ہوا
تاج ایسے شخص کا طالب ہوا

دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو دنیا کی مادی اشیاء کی جانب راغب ہوتی ہیں اور پوری زندگی اسی کی حرص و ہوس میں مبتلا رہتی ہیں لیکن ان کی خواہشات کا ناختم ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس قسم کے افراد کے درمیان مقابلہ ہی دنیا میں جنگ وفساد کا باعث ہوتا ہے لیکن ایک کردار وہ بھی ہوتا ہے جو اپنے نفس کا محکوم نہیں ہوتا بلکہ نفس اس کا محکوم ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی لالچ ان کے کردار پر غالب نہیں آ سکتی بلکہ تاج وتخت ان کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ وہ، یہی رویہ ان کو دیگر افراد سے ممتاز کرتا ہے اور ان کا نام تاریخ میں قائم ودائم رہتا ہے۔ حضرت علیؑ انہی کے سردار اور آقا ہیں۔

زیرِ پاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

☆☆☆☆

نفس پر قابو تھا یونہی فاتح خیبر ہوئے
روزِ محشر بھی وہی تو ساقی کوثر ہوئے

دنیا میں وہی شخص کامیاب وکامران ہوتا ہے جو اپنے ہر عمل کو خدا کی مرضی کا طابع کر لیتا ہے کیونکہ وہی سیدھا اور سچا راستہ ہے جس پر چل کر کامیابی نصیب ہوتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کوئی اپنے نفس کو اس درجہ پر قابو کر لے کہ اس کی کوئی جسمانی و مادی خواہش اس پر غالب نہ آسکے اور اس کا ہر لمحہ عمل خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کے لیے وقف ہو تو بڑی سے بڑی مشکل آسان تر ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت علیؑ کی ذات ہے، اس لیے وہ خدا کی راہ میں جس جانب بھی قدم بڑھاتے فتح ونصرت نصیب ہوتی، چاہے وہ جنگ خیبر کا معرکہ ہو یا کوئی اور، اسی لیے جنت میں کوثر کا مالک ومختار انہیں بنایا گیا اور ساقی کوثر کا لقب دیا گیا۔

از خود آگاہی ید الٰہی کند
از ید الٰہی شہنشاہی کند

☆☆☆☆

اس خود آگاہی نے بخشی ہے یدالٰہی اسے
اور یدالٰہی نے بخشی ہے شہنشاہی اسے

علامہ اقبالؔ رسولؐ خدا کے بعد جس ہستی سے سب سے زیادہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ حضرت علیؑ کی ہے، ان کے خیال میں آپ کا کردار ایک ایسی مثال ہے جس پر انہیں اپنا رہنما قبول کر کے ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ یہی دنیا میں اور آخرت میں کامیابی کا راستہ ہے کیونکہ حضرت علیؑ کو معرفت نفس حاصل تھی جو قرب الٰہی حاصل کرنے کا لازمی جز ہے اور عشق الٰہی کی پہلی منزل ہے۔ یہ مرتبہ حضرت علیؑ کو حاصل تھا اسی لیے آپؑ کو یداللہ یعنی ''اللہ کا ہاتھ'' کے لقب سے پکارا گیا جس کی انتہا شہنشاہی ہے، وہ شاہی نہیں جو دنیا میں مختصر وقت کے لیے حاصل ہوتی ہے بلکہ معرفت کی وہ بادشاہت ہے جو قیامت تک کے لیے دل ودماغ اور روح کو مسخر کر لیتی ہے۔

ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم

☆☆☆☆

خود رسولؐ اللہ نے ان کو کہا باب العلوم
آپ کے زیرِنگیں ہیں یہ حجاز و چین و روم

مشہور حدیث ہے ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ'' یعنی اگر کسی شہر علم میں داخل ہونا ہے تو اسے باب العلم سے گزرنا ہی ہوگا، اس لیے جب تک حضرت علیؓ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک رسولؐ اللہ کا قرب حاصل ہوسکتا ہے اور نہ ہی خدا کا پیغام سمجھ میں آ سکتا ہے، اسی کا اظہار اقبالؔ نے یہاں کیا ہے۔ وہ حدیث رسول کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ شہرِ علوم کا دروازہ ہیں اگر کسی کو علم کی پیاس بجھانی ہے تو وہ اسی سرچشمہ علوم سے ہی سیراب ہوسکتا ہے اس لیے جہاں بھی علم کی روشنی ہے چاہے حجاز ہو یا چین و روم یعنی پورا عالم آپ ہی کے علم سے منور ہے۔

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن
تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن

☆☆☆☆

سنگ بن جا مثل گل نازک بدن
تا کہ تجھ سے ہی پڑے بنیاد دیوار چمن

گزشتہ کئی صدیوں سے امت مسلمہ پسماندگی اور پستی کا شکار چلی آ رہی ہے، اقوام عالم میں اس کا مقام ہے اور نہ ہی کوئی حیثیت ہے، وہ بے عملی کا شکار ہے جو اس صورت حال کی وجہ سے ہے۔ اس شعر میں اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے پھول کی طرح نازک بدن اٹھ اور مضبوط پتھر کی طرح ہو جا تا کہ تجھ سے امت کے چمن کی دیوار کی بنیاد رکھی جا سکے تا کہ کوئی غیر ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے اور تو بھی ترقی کر کے دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے۔

از گلے خود آدمے تعمیر کن
آدمے را عالمے تعمیر کن

☆☆☆☆

پہلے بچوں کو بنا یاں آدمی
پھر بنا لے گا جہاں یہ آدمی

اس امر سے، ہم میں سے کون واقف نہیں کہ انسانی معاشرے کا کوئی بھی چھوٹا بڑا اگر وہ خواہ وہ گھر ہو یا خاندان، قبیلہ اور قوم اس کا مستقبل اس کی آنے والی نسلوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر ان کو اخلاق و کردار کی صحیح تعلیم دی جائے اور ان میں علم و عمل کا جذبہ پیدا کر دیا جائے تو قوم کبھی کمزور و پسماندہ نہیں رہ سکتی۔ یہی حقیقت اس شعر میں بیان کی گئی ہے کہ پہلے خود اپنے گھر کے بچوں کو تربیت دے کر اچھا آدمی بناؤ جب یہ اس دولت سے سرفراز ہو جائیں تو یہ خود جہانِ تازہ تعمیر کر لیں گے۔

گر بنا سازی نہ دیوار و درے
خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

☆☆☆☆

تو نے گر رکھی نہ خود گھر کی بنا
تیری مٹی سے زمانہ اینٹ خود لے گا بنا

جو ذی شعور افراد قوم اور اس کی پستی و پسماندگی پر نظر رکھتے ہیں وہ نہ صرف اس حالت زار سے پریشان رہتے ہیں بلکہ اسے ہوشیار بھی کرتے رہتے ہیں کہ اگر قوم و ملت اس خوابِ خرگوش سے بیدار نہ ہوئی تو کچھ عرصے میں وہ اقوام عالم میں اس مقام پر پہنچ جائے گی جہاں سے اٹھنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہاں اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور قوم سے کہا جا رہا ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ، اگر تم نے اپنے در و دیوار کے تشخص کی عمارت خود تعمیر نہیں کی تو پھر دوسرے تمہاری بنیادوں پر اپنی تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر کر لیں گے اور تم مٹ جاؤ گے۔

اے زجورِ چرخ ناہنجار تنگ
جام تو فریادیٔ بیدادِ سنگ

☆☆☆☆

آسماں کے ظلم سے رہتا ہے کیوں انسان تنگ
جبکہ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اب تک یہ سنگ

جس وقت سے انسان نے اس دنیا میں جنم لیا ہے اسی وقت سے تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر پریشانیوں کا شکار رہا ہے جبکہ خدا نے نہ صرف یہ کہ یہاں انسانوں کی تمام ضروریات کے لیے اس کثرت سے اشیاء بخشی ہیں کہ اگر ان کا انتظام منظم و متوازن طریقہ سے کیا جائے تو تمام پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ ان کے حصول کے لیے عقل دے کر انہیں قبضہ قدرت میں بھی کر دیا ہے۔ اقبال اس شعر میں اسی بات پر حیران ہیں کہ اس سب کے باوجود انسان تنگ کیوں ہے، تھوڑی سی محنت اور توجہ سے ان میں کمی ہو سکتی ہے۔

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا
سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

☆☆☆☆

نالہ و فریاد در کب تلک
پیٹے گا یوں سینہ و سر کب تلک

پسماندہ، غریب اور کمزور قوموں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی حالتِ زار سے سبق حاصل کر کے علم کا حصول اور عمل پیہم کو اپنا شعار بنا کر ترقی کی راہ تلاش کریں اور اقوام عالم میں اپنی عزت و توقیر قائم کریں، وہ اس صورت حال کا الزام دوسرے پر رکھ کر حالت مایوسی اور غم کا شکار ہو جاتی ہیں اور اپنا شیوہ نالہ و فریاد و ماتم کو بنا لیتی ہیں۔ اقبال اسی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے قوم سے مخاطب ہیں کہ آخر اتنی ناکامی پر یہ رونا دھونا کب تک ہوتا رہے گا اور اپنی کمزوری پر آہ وزاری و سینہ کوبی کب تک جاری رہے گی۔

در عمل پوشیدہ مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات

☆☆☆☆

زندگی کی کامیابی جس عمل کے ساتھ ہے
لذت تخلیق اے انسان تیرے ہاتھ ہے

انسان کو خدا نے اس دنیا میں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے اس کے لیے اسے عقل جیسی نعمت سے نوازا گیا تا کہ وہ جس منصب پر فائز کیا گیا ہے اسے ثابت کرے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کے لیے محنت نہ کی جائے جس کا مطلب ہے کہ انسان کائنات میں موجود خدا کی نشانیوں کو تلاش کرے اور اسے مخلوق خدا کی بھلائی اور فائدے کے لیے استعمال کرے۔ یہ عمل وقتی یا عارضی نہیں بلکہ مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ اسی تخلیقی عمل میں کامیابی اور ترقی کا راز پنہا ہے جس نے یہ کرلیا وہ سرخ رو ہو گیا۔

خیز و خلاق جہانِ تازہ شو
شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

☆☆☆☆

جاگ اے انسان اور تخلیق کر دنیا نئی
جس کی اصلاح کو خلیل اللہ کی کر پیروی

انسانوں کو عموماً اور امت مسلمہ کو خصوصاً بیدار کرنے اور آئندہ آنے والے وقت و حالات کے لیے تیار کرنا اقبال کی فکری اساس کا اہم ترین جز ہے، وہ اپنے اس پیغام کو بار بار دہراتے ہیں اور تاریخ کے مختلف کرداروں سے اس کی مثالیں دیتے ہیں۔ یہاں بھی اسی پیغام کی شدید ضرورت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اے انسانو! تم بیدار ہو اور ایک ایسی نئی دنیا تخلیق کرو جس میں ایک حقیقی معاشرہ تشکیل پائے لیکن اس کے لیے اپنے ارادے کی حقیقت اور سچائی پر اس حد تک یقین کرنا ہو گا جتنا حضرت ابراہیمؑ کو تھا کہ وہ آگ میں بلا خوف و خطر چلے گئے۔

با جہانِ نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن
☆☆☆☆
اس جہانِ ناموافق سے اگر تو ڈر گیا
یوں سمجھ میدان میں لڑنے سے پہلے مر گیا

کسی بھی نظریہ کی عملی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے جدو جہد کرنے والا گروہ اپنی سچائی پر اعتقاد کی حد تک یقین رکھے تا کہ ان میں اپنے مد مقابل قوتوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت پیدا ہو اور اگر ایسا نہ ہوا تو کامیابی ناممکن ہے۔ یہی حقیقت یہاں بیان کی گئی جو اقبال نے مشورے کی صورت میں مسلمانوں کو دیا ہے کہ وہ حصول علم پیہم کو رکھیں جس سے ان کو اپنی ذات اور نظریہ کی عظمت و صداقت کا یقین ہوگا اور وہ مخالفین کا مقابلہ کر سکیں گے ورنہ وہ مقابلے سے پہلے ہی شکست سے دو چار ہو جائیں گے۔

مردے خود دارے کہ باشد پختہ کار
بامزاجِ او بسا زد روزگار
☆☆☆☆
جس میں خودداری ہو، جو ہو پختہ کار
وہ جھکا لیتا ہے دنیا کو فخر و افتخار

اس دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں، ایک وہ ہیں جو زمانے کے ساتھ چلتے ہیں اور اکثریت انہیں پر مشتمل ہے جبکہ ایک محدود تعداد ان افراد پر مشتمل ہے جن کے ساتھ زمانہ چلتا ہے یہ طبقہ انتہائی خوددار اور تجربہ کار ہوتا ہے۔ اس کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے، اس کو ادراک ہوتا ہے کہ آنے والے وقت کا کیا تقاضا ہے، اسی لیے ان کو زمانہ ساز کہا جاتا ہے۔ اس شعر میں ایسی ہی ہستیوں کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے، اقبال کے خیال میں ایک خوددار اور اپنے نظریہ پر یقین محکم رکھنے والا زمانے کے آگے نہیں جھکتا بلکہ اپنے علم و عمل سے زمانے میں اپنے مطابق تبدیلی لاتا ہے۔

گر نہ سازد با مزاج او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
☆☆☆☆
بات اس کی حب جہاں سنتا نہیں
وہ بھی پروا پھر کوئی کرتا نہیں

جب کوئی فرد اپنی جرات و ہمت کے ساتھ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس دنیا کو بدل دے جس میں ناانصافی ہے، پستی اور بے عملی ہے، آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ معدوم ہو چکا ہے، اپنی اس حالت کا ادراک و احساس مٹ چکا ہے جس کی وجہ سے نہ کوئی جدو جہد اور نہ تبدیلی کی خواہش ہے اور اس شخص کی تبدیلی کی آواز پر لبیک کہنے والا کوئی نہیں ہے، تو ایسے میں مایوس و ناامید ہو کر خاموش ہو جانے کے بجائے وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، چاہے وہ آسمان ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کی جدو جہد جاری رہتی ہے۔

بر کنِد بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را
☆☆☆☆
وہ بدل دے جڑ سے موجودات کو
اور کرے تخلیق خود ذرات کو

اس شعر میں بھی ان عظیم ہستیوں کے کردار کا تذکرہ ہے جو اقبال کے یہاں علم و عمل کے مثالی کردار ہیں اور اپنے گردو پیش کے حالات سے غیر مطمئن ہو کر ان کو مثبت انداز میں تبدیل کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہیں اور اپنے عزم و استقلال سے نہ صرف موجودہ صورت حال کو ختم کر دیتے ہیں بلکہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد رکھتے ہیں تا کہ آئندہ آنے والی نسلیں اس پسماندگی کا شکار ہو کر غیروں کے لیے نوالا تر نہ بن جائیں اور خود اپنا مستقبل تعمیر کریں جس کے مالک بھی وہی ہوں۔

گردش ایام را برہم زند
چرخ نیلی فام را برہم زند

☆☆☆☆

بدلے گا وہ گردش ایام کو
اور بدلے چرخ نیلی فام کو

اقبال کے یہاں عالم انسانیت کو عموماً اور امت مسلمہ کو خصوصاً معاشی، علمی، تہذیبی، معاشرتی پستی سے نکال کر ایک خوشحال، پُرامن مساوات اور بھائی چارے اور ترقی کی راہ پر ڈالنے کی خواہش اس قدر جاری و ساری تھی کہ وہ اس تبدیلی کے عملی کردار کا تذکرہ تسلسل سے کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ اسی کردار کا خاصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت ایک ایسے مثالی کردار کی ضرورت ہے جو اس زمانے کی گردش اور صبح و شام کو بدل دے اور یہی نہیں اس میں اتنی طاقت و ہمت ہو کہ وہ آسمان بھی بدل سکتا ہو۔

می کند از قوت خود آشکار
روزگار نو کہ باشد ساز گار

☆☆☆☆

اپنی طاقت سے زمانے کو بدل سکتا ہے وہ
سازگار حالات کرسکتا ہے وہ

انسانی تاریخ پر اگر سرسری سی بھی نظر ڈالیں تو ہمیں ایک سے زیادہ کردار ایسے مل جائیں گے جنہوں نے اپنی ہمت اور جدوجہد سے معاشرے میں موجود برائیوں و ناانصافیوں کو ختم کر دیا مگر اس کے لیے عالی کردار اور اپنے موقف کی سچائی پر مکمل اعتماد و اعتقاد ہونا ضروری ہے۔ اس شعر میں بھی اقبال ایسے ہی بلند مقام کردار کی خاصیت بیان کر رہے ہیں کہ وہ اپنے کردار کی عظمت عمل کی قوت اور خیال کی سچائی کی طاقت سے نہ صرف یہ کہ ایسے حالات پیدا کرسکتا ہے بلکہ ان کی بنیاد پر وہ حالات کو یکسر بدل بھی سکتا ہے۔

درجہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپر دن زندگیست

☆☆☆☆

زندگی مردانگی سے گر نہ ہو ممکن تو ایسا چاہیے
جان ہی مردانگی سے ہم کو دینا چاہیے

ہمارے سامنے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں کوئی عظیم ہستی حق وصداقت کے لیے اٹھی ہو اور باطل کے خلاف آواز بلند کی ہو مگر جب معرکہ حق و باطل وقوع پذیر ہو تو اسے وقتی اور دنیاوی معیار پر فتح حاصل نہ ہوئی، مگر سچائی کی گواہی تو تاریخ دیتی ہے اور یہ فیصلہ کرتی ہے کہ فتح کس کی ہوئی اور یہ فیصلہ حق کے لیے ہوتا ہے کیونکہ حق قائم ہونے کے لیے اور باطل مٹنے کے لیے آیا ہے۔ یہاں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر معرکۂ کارزار میں یہ ممکن نہ ہو کہ حق کی ظاہری فتح ہو تو مرد مجاہد کو اپنی سچائی کے ثبوت وقیام کے لیے جان قربان کر دینا ہی بہتر ہے۔

آزماید صاحب قلب سلیم
زور خود را از مہمات عظیم

☆☆☆☆

آزماتے ہیں وہی رکھتے ہیں جو قلب سلیم
اپنی خودداری سے کرتے ہیں مہمات عظیم

انسان کا اس دنیا میں پیدا ہونا یا بھیجا جانا دراصل ایک آزمائش ہے کیونکہ خدا کی جانب سے اسے اچھائی اور برائی میں تفریق بتا دی گئی ہے۔ حق و باطل کی نشان دہی کر دی گئی ہے اور پھر یہ امتحان ہے کہ انسان کس راستے کو اختیار کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ اس فرق کو عملاً ظاہر کرنے کے لیے ایسے کردار بھی ہوئے جنھوں نے اپنے عمل سے ظاہر کیا کہ اس مرحلے سے کس طرح گزرنا ہے۔ اس شعر میں اسی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کے خیال میں اس حق و باطل کے معرکہ میں صرف ان ہی ہستیوں کی آزمائش ہوتی ہی جو قلب سلیم رکھتی ہیں اور اپنے کردار سے بڑی سے بڑی

مہمات سر کرتی ہیں۔

عشق باد شوار در زیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
☆☆☆☆
عشق میں مرنے پہ بھی تیار رہنا چاہیے
گل سمجھ کر آگ کے شعلوں پہ چلنا چاہیے

اقبال کی شاعری یا فلسفہ کے جو چند بنیادی عناصر ہیں ان میں عشق کلیدی حیثیت رکھتا ہے، ان کے یہاں عشق سے مراد عشق حقیقی ہے۔ یعنی خدا سے عشق جو انسان کو تمام مادی و دنیاوی خواہشات سے آزاد کر دیتا ہے اور بندے کے لیے اس کی زندگی بھی غیر اہم ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں یہی فکر بیان کی گئی ہے کہ خدا کے عشق میں بندے کو جان دینے کو بھی تیار رہنا چاہیے تاکہ اس کا پیغام زندہ رہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کے حضرت ابراہیمؑ جو بے خطر آگ میں چلے گئے تھے۔

ممکنات قوتِ مردانِ کار
گرد د از مشکل پسندی آشکار

☆☆☆☆

کام کو آساں بنانے میں ہے انساں کا وقار
جھیل لے مشکل تو بس مردانگی ہے آشکار

حضرت اقبال جفاکشی، مشقت، تندہی اور عمل پیہم سے محبت کرتے ہیں اور تن آسانی، کاہلی اور بغض وعداوت کو مذموم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ کسی کام کو آسان بنانے میں ہی انسان کا وقار ہے اور مشکلوں کو جھیل جانے ہی سے انسان کی مردانگی کا پتہ چلتا ہے۔

حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را ایں یک آئین است و بس
☆☆☆☆
پست ہمت لوگوں کو بغض و حسد ہوگا قبول
اور انہوں نے زیست کا اس کو بنایا ہے اصول

جولوگ خود ذاتی حیثیت میں کسی قابل نہیں ہوتے اور اپنی کم علمی اور بے عملی کی وجہ سے اس دنیا میں پستی کا شکار ہوتے ہیں وہ بجائے اس کے کہ اپنی حالت کو سدھارنے کے لیے تدبیریں کریں، اپنے علم میں اضافہ کریں اور عمل سے اپنی حالت کو بہتر بنا کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوں، وہ ترقی کرنے والے افراد اور اقوام کی حالت سے بجائے سبق حاصل کرنے کے ان سے بغض وعناد رکھنا شروع کر دیتے ہیں اور حسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کا حاصل اور اصول ہو جاتا ہے، یہاں اقبال نے اسی صورت حال کو بیان کیا ہے۔

زندگانی قوتِ پیدا ستے
اصلِ ازذوق استیلا ستے
☆☆☆☆
زندگانی قوت تخلیق سے تعبیر ہے
ذوقِ غلبہ جس کی اک لکھی ہوئی تحریر ہے

زندگی میں کامیابی کا واحد اصول یہ ہے کہ انسان اپنی قوت تخلیق میں اضافہ کرے۔ نئے اور ترقی پسند خیالات کو فروغ دے لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اس دنیا اور کائنات میں قدرت کی جانب سے پیدا کیے پوشیدہ خزانوں کو تلاش کرنے اور ان رازوں سے پردہ اٹھانے کی جستجو نہ کرے جو کامیابی کی کنجی ہے۔ جو شخصیتیں یا اقوام اس میں فتحیاب ہو جاتی ہیں وہی اس دنیا میں کامیاب ہو کر ترقی کرتی ہیں اور دوسروں پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں اور دیگر اقوام ان کی دست نگر ہو جاتی ہیں۔ اس شعر میں اسی اصول کی نشاندہی کی گئی ہے۔

عفوِ بیجا سردیٔ خونِ حیات
سکتۂ دربیتِ موزونِ حیات

☆☆☆☆

معاف کرنا بدنہادوں کو ہے گویا بزدلی
زندگی میں اس سے پیدا ہوتی ہے بیشک کمی

کسی کمزور اور بے بس انسان کو معاف کردینا یقیناً بہت اعلیٰ ظرفی کا کام ہے، بشرطیکہ اس کے بعد یہ امید ہو کہ وہ شخص اپنی بداعمالی سے باز آجائے گا لیکن اگر نتیجہ اس کے برعکس ہونے کی امید ہو تو یہ ناسمجھی کی علامت ہوگا کیونکہ معاشرہ ان بدکردار افراد کے طور طریقوں سے آزاد نہیں ہوگا اور وہ برائی اپنی جگہ رہے گی۔ اس لیے ایسے افراد کے ساتھ رعایت کرنا مناسب نہیں بلکہ ان کو اپنی زندگیوں سے باہر نکال کر معاشرے کو صاف و پاک بنانا چاہیے ورنہ زندگی میں ہمیشہ کچھ کمی موجود رہے گی۔ اقبال نے اسی خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی راقناعت خواندہ است

☆☆☆☆

آج جو ذلت سے ہم آغوش ہے
بس قناعت کی نقابوں میں وہی روپوش ہے

آج دنیا میں انسانوں کی حالت پر غور کریں تو بخوبی نظر آجائے گا کہ یہاں اکثریت پستی اور غربت کی زندگی گزار رہی ہے لیکن انہیں اپنی اس حالت کا احساس ہے اور نہ ہی اس سے باہر نکلنے کے لیے کوئی اپنے اندر تحریک بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مزید پستی میں گرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ترقی یافتہ اقوام اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ مزید افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اپنی اس حالت کو قناعت سے تعبیر کر کے اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں اور خوش رہتے اور مطمئن ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی حالت تبدیل ہونے کا امکان کم سے کم

ہوتا جاتا ہے۔یہاں اس صورت حال کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

☆☆☆☆

ہاں بڑھاپا زندگی کو چاٹ جایا کرتا ہے
اس میں پنہاں خوف و جھوٹ ہر دم ستایا کرتا ہے

کمزوری اور ناتوانی ایسی کیفیت ہے جو انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور وہ معاشرے میں عزت و وقار سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل بے عمل ہونے کی علامت ہے، جب کوئی عمل سے دور ہو جاتا ہے تو وہ ترقی کرنے کے قابل نہیں رہتا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مزید پستی کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس میں اتنی ہمت نہیں رہتی کہ وہ طاقت ور کے سامنے عملاً کچھ کرنا تو دور کی بات بول بھی نہیں پاتا۔ جس کی وجہ سے ہر دم پریشان اور خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کیفیت میں پھر وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے کیونکہ اس میں حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

از مکارم اندرونِ اوتہی است
شیرش از بہرِ ذمائم فربہی است

☆☆☆☆

یہ جو کمزوری ہے کرتی ہے بشر کو کھوکھلا
اور جرائم کو ہوئی اس سے توانائی عطا

یہ ایک عام اصول ہے جو دنیا میں ازل سے ہے اور ابد تک جاری رہے گا کہ کمزور ہمیشہ طاقت ور کے سامنے سرنگوں رہا ہے اور جب تک یہ تفریق جاری رہے گی، اس وقت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تاوقت کہ کمزوروں کے پاس بھی طاقت نہ آ جائے اور وہ بھی اپنے حق کے لیے اٹھ نہ کھڑے ہوں کیونکہ کمزوروں کے پاس نا ہمت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی ولولہ، جس کی وجہ سے وہ اندر سے، کھوکھلے ہو جاتے ہیں، ہر کوئی اُن کو زیادتی کا شکار بناتا ہے جس کی وجہ سے ہر طرف فریب اور

جرائم کا دور دورہ ہوتا ہے جس کے سبب معاشرہ تباہی کا منظر پیش کر رہا ہوتا ہے۔

هوشیار! اے صاحب عقل سلیم
کمینها می تشیند ایں غنیم

☆☆☆☆

ہوشیار! اے صاحب عقل سلیم
گھات میں ہے ناتوانی کا غنیم

معاشرے کی پسماندگی کو دور کر کے اس کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اس کا ادراک رکھتے ہیں اور انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے ارد گرد کے حالات کس قدر خراب ہیں اور یہی نہیں اپنے علم و مشاہدہ کے بنا پر یہ بھی جانتے ہیں کہ ان خرابیوں کا علاج کر کے انہیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے تا کہ معاشرے میں ایک بہتر نظام قائم ہو اور وہ بھی باعزت گروہ میں شامل ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے جو عقل سلیم رکھتے ہیں اور قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہاں اقبال اپنی قوم کے افراد سے مخاطب ہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ کیونکہ کمزوری و ناتوانی جیسا دشمن تمہاری تاک میں بیٹھا ہے۔

گر خردمندی فریب او مخور
مثل حربا ہر زماں رنگش دگر

☆☆☆☆

تو اگر ہوشیار ہے کھانا نہ اس سے کچھ فریب
رنگ بدلے مثل گرگٹ یہ ہے اس کا ایک عیب

انفرادی ہو یا اجتماعی کمزوری اور پستی کے مختلف انداز ہوتے ہیں۔ کبھی اس کا اظہار ایک طریقے سے ہوتا تو کبھی دوسرے پہلو سے یہ ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی یہ علمی پستی کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی معاشی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اشکال میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ غرض اس کے الگ الگ رنگ ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ گرگٹ کے ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایک جانب دیکھ کر فیصلہ نہیں

کرنا چاہیے بلکہ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لینا چاہیے ورنہ دیکھنے والے فریب میں مبتلا ہو کر دھوکہ کھا جائیں گے اور ان کی حالت زار تبدیل ہونے کے بجائے جوں کی توں رہے گی۔

شکل او اہل نظر نشنا ختند
پردہ ہا برروئے او اندا ختند

☆☆☆☆

اہل دانش اس کو پہچانے نہیں
کون سا چہرہ پسِ پردہ ہے یہ جانے نہیں

ہماری تنزلی کا احساس خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کو محسوس کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ یہ کوئی اچانک وقوع پذیر ہونے والا واقعہ نہیں ہوتا بلکہ ایسا تخریبی عمل ہی جو آہستہ آہستہ معاشرے کو گھن کی طرح ختم کرتا جاتا ہے۔ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اس صورت حال سے یہ نہیں کہ عام انسان بے خبر رہتے ہیں بلکہ جو طبقہ اہل نظر اور دانشور کہلاتا ہے وہ بھی اس کو محسوس نہیں کر پاتا اور بے خبر رہتا ہے کیونکہ تنزلی کے عمل پر اتنے پردے پڑے ہوتے ہیں کہ وہ بظاہر نظر نہیں آتے۔ اقبال نے ان ہی حالات کی نشاندہی کی ہے۔

گاہ او مستور در مجبوری است
گاہ پنہاں در تہ معذوری است

☆☆☆☆

خود کبھی مجبوری کے پردے میں چھپ جاتی ہے یہ
اور کبھی معذوری کے پیچھے چلی جاتی ہے یہ

کمزوری میں کیونکہ ہمت وحوصلہ جواب دے چکا ہوتا ہے اور اتنی بھی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے وجود کا احساس دلا سکیں۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی جدوجہد کر سکیں بلکہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور اسی کو غنیمت جان کر زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ اپنی بے عملی اور کم ہمتی کو مجبوری کا نام دے کر اس کے پردے میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی اپنی حالت کو معذوری کا

نام دے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔غرض اپنی حالت زار میں تبدیلی نہ لانے کے مختلف جواز تلاش کر لیتے ہیں اور پستی کا شکار رہتے ہیں۔

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود
دل زدستِ صاحبِ قوت ربود
☆☆☆☆
جب تن آسانی کی صورت میں یہ آئے
تب مجاہد اپنی طاقت بھول جائے

جب آدمی زندگی کے مختلف شعبوں میں آسانیاں تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے اور عمل کی طاقت سے محروم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے دیگر افراد اور قوموں سے پیچھے رہ جاتا ہے، نہ اس کی اقوام عالم میں کوئی وقعت ہوتی ہے اور نہ کوئی عزت۔ یہ اصول صرف عام انسانوں کے ہی لیے نہیں ہے بلکہ کتنا ہی زور آور مجاہد ہو وہ بھی اگر آرام و تن آسانی کا عادی ہو کر بے عمل ہو جائے تو وہ بھی پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔اس طرح اس کا بھی حاصل کردہ اعلیٰ مقام ضائع ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کو تن آسانی کے بجائے جدوجہد میں مصروف رہنا چاہیے۔

با توانائی صداقت تَو اَم است
گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است
☆☆☆☆
درحقیقت ہے صداقت ہی توانائی کا نام
اور پالینا اسے گویا ملے خود جم کا جام

علامہ اقبال اس حقیقت کا اپنے پیغام میں بارہا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ ناتوانی اور کمزوری نہ صرف فرد کی بلکہ معاشرے اور قوم کی سب سے بڑی دشمن ہے اور توانائی ہی وہ عنصر ہے جو ان کو عزت و وقار کے ساتھ دنیا میں نمایاں مقام دلا سکتا ہے لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ قوم کو اپنے عقیدے کی صداقت پر یقین ہو کیونکہ اس یقین کے بغیر کسی بھی گروہ میں وہ توانائی پیدا نہیں

ہوسکتی جو کامیابی کے لیے درکار ہے۔ اگر یہ حاصل ہوجائے تو کوئی بھی رکاوٹ راستہ نہیں روک سکتی جس کے بعد ایسا ہے جیسے جام جم اس کے ہاتھ آ گیا ہے اور پوری دنیا اس کے سامنے ہے۔

زندگی کِشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

☆☆☆☆

زندگی کھیتی ہے تو قوت ہے فصل
حق و باطل کا یہی ہے رمز دراصل

انسانی زندگی کا حاصل وہ قوت ہے جو قدرت نے اسے بخشی ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف یہ کہ اس کائنات میں پوشیدہ خزانے آشکارہ کر کے خدا کے وجود کو ظاہر کرتا ہے بلکہ انسانی معاشرے کو عدل وانصاف پر مبنی نظام بھی دیتا ہے تاکہ تمام بنی نوع انسان کو ایک بہتر زندگی میسر ہو جس کے لیے ضروری ہی کہ یہاں سے باطل کا خاتمہ ہو اور حق کا نظام قائم ہو۔ اس کے لیے اس قوت کا موجود ہونا ضروری ہے جو طاقت ور ہو اور جو باطل پر غلبہ حاصل کر کے حق کو قائم کرے، اسی لیے اگر زندگی کو ایک کھیت تصور کیا جائے تو اس کی فصل قوت ہے۔

مدعی گر مایہ دار از قوت است
دعویٰ او بے نیاز از حجت است

☆☆☆☆

مدعی ہوتا ہے اگر ہو طاقتور
دعویٰ و حجت کا اس پر کیا اثر

طاقت ور افراد خود اپنی ذات میں اس قدر قوت رکھتے ہیں کہ وہ اپنے طور طریقوں اور قانون کے مطابق نظام نہ صرف تشکیل دیتے ہیں بلکہ اس کے مطابق چلاتے ہیں اور دیگر لوگوں کو ان کی قوت کے آگے سرخم کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے آگے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ قدرت نے کمزور اور قوی کے یہی اصول بنائے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ زبانی طور پر اپنے حق کے

لیے کوئی دعویٰ، دلیل یا ثبوت پیش کر سکتے ہیں جس کو قبول کرنا یا نہ کرنا صاحب اختیار کے پاس ہے کیونکہ ان میں سے اگر کسی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا تو وہ ان کو رد بھی کر سکتا ہے۔

باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش راحق داند از بطلانِ حق

☆☆☆☆

ہو اگر قوت کبھی باطل کے پاس
اپنی باتوں کو وہ دے حق کا لباس

دنیا میں طاقت ایک ایسا ذریعہ ہے کہ کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی بات کو دوسروں پر نافذ کر دے اور کسی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ طاقت کے آگے سر جھکا لے اور اپنی مرضی کو پس پشت ڈال دے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کہنے والے کی بات سچائی اور حق پر مبنی ہو، اسی لیے اگر طاقت باطل کے ہاتھ میں آ جائے تو وہ چاہے غلطی پر ہو، اپنی بات منوانے کی حیثیت میں ہوتا ہے اور قوت کے بل پر باطل کو ہی حق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے یہ مختصر وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

از فنِ او زہرِ کوثر می شود
خیر را گوید شرے شری شود

☆☆☆☆

زہر کو کوثر بنا سکتا ہے یہ
خیر کو بھی شر بنا سکتا ہے یہ

تاریخ انسانیت اس کی گواہ ہے کہ طاقت ور لوگ جب مکمل طور پر معاشرے پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو ان کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح چاہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق معاشرہ تشکیل دیں۔ چاہے وہ کتنی ہی غلطی پر ہوں کیونکہ ان کی کہی ہوئی ہر بات سچ اور حق سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اگر زہریلے پانی کو بھی آب کوثر کہہ

دیں تو لوگوں میں اس سے انکاری کی جرأت نہیں ہوتی، اسی طرح سے وہ خیر کے عمل کو بھی برا قرار دے کر اسے رَد کر سکتا ہے، یہ طاقت کا اثر ہے۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر
☆☆☆☆
تو سمجھ بار امانت کی غرض
جس کی خاطر تو بنا خلیفہ فی الارض

خدا نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو یہ کوئی بے مقصد عمل نہیں تھا بلکہ ہر فرد میں کوئی نہ کوئی صلاحیت عطا کی جس کو بروئے کار لانے کے لیے عقل جیسی نعمت سے نوازا اور ایک محدود حد تک بااختیار بنایا، اسی لیے اسے خلیفہ فی الارض یا اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا۔ یہ ساری صلاحیتیں اور درجات دراصل خدا کی انسان کے پاس امانت ہیں جن کو عملی شکل دینا فرض ہے ورنہ یہ خیانت کے زمرے میں آ جائیں گی۔ یہاں وہی افراد اور قومیں کامیاب اور ترقی کرتی ہیں جو اس امر کو سمجھ جاتی ہین اور ہر عمل کر کے حق بشریت ادا کرتی ہیں۔

از رموز زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو
☆☆☆☆
جستجو سے زندگی کے راز پانا چاہیے
سر نہ غیر اللہ کے آگے جھکانا چاہیے

انسان کی زندگی بے شمار رازوں کا مجموعہ ہے جبکہ عرصہ حیات محدود ہے، اس لیے ضروری ہی کہ اس قلیل وقت میں زندگی کا جو مقصد ہے اس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کے سربستہ رازوں سے جتنا ممکن ہو پردہ اٹھایا جائے کیونکہ اپنی دنیا میں خدا کے وجود کی علامتیں اور نشانیاں موجود ہیں، اس حوالے سے انسان جتنی کامیابی حاصل کرتا جائے وہ خدا کی

حقیقت سے واقف ہوتا جائے گا۔اس سے عقیدے میں پختگی آتی جائے گی جس کی وجہ سے وہ ظالم اور جاہل کے آگے سر نہیں جھکائے گا۔

چشم و گوش و لب کشا اے ہوش مند
گر نہ بینی راہِ حق برمن بخند

☆☆☆☆

چشم و گوش و لب سے اپنی باطنی قوت ابھار
پھر تو ہوجائے گا تجھ کو حق پہ بیشک اختیار

اگر انسان اپنے حواس خمسہ کا صحیح استعمال کرے تو اس کو یقیناً راہِ حق مل جائے گی کیونکہ اگر وہ کھلی آنکھ سے بظاہر قدرت کا مشاہدہ کرے اور غور کرے تو اس کو خدا کی بے شمار نشانیاں نظر آ جائیں گی، اسی طرح اگر ان ہستیوں کی آواز پر لبیک کہے جنہیں خدا نے اس دنیا میں انسانوں کی رہنمائی اور حق کے قیام کے لیے بھیجا ہے تو یقیناً یہ پیغام اس کی روح میں اتر جائے گا اور اس کا ایمان حق وصداقت پر اس طرح پختہ ہوجائے گا کہ خود اس کو لے کر آگے بڑھے اور دیگر انسانوں کو اس جانب دعوت دے گا جس سے اس کو سچائی پر مکمل اختیار حاصل ہوجائے گا۔

نعرۂ حیدر نوائے بوذر است
گرچہ از حلقِ بلال و قنبر است

☆☆☆☆

نعرہ حیدر ابوذر کی صدا
یہ بلالی ہے اذان اور یہ ہے قنبر کی ندا

اقبال حضرت علیؑ کی شان اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت حیدر کرّار نے جو نعرہ حق بلند کیا اور اپنے علم وعمل سے نہ صرف یہ کہ زبانی اس کا بیان کیا بلکہ عملاً بھی ایسا بلند کردار پیش کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس اعلیٰ معیار کی اگر مثال دیکھنی ہو تو حضرت ابوذر غفاری کو دیکھو کہ ویسا کوئی دوسرا نہیں۔ یہ سلسلہ انہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ حضرت بلال کی اذان

بھی یہی پیغام دیتی ہے تو دوسری جانب حضرت علیؑ کے غلام جناب قنبر بھی اسی سلسلے کی عملی کڑی ہیں جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

چوں علی در ساز بانانِ شعیر
گردن مرحب شکن خیبر بگیر

☆☆☆☆

جَو کی روٹی کھا علی سا بن جا شیر
مرحب و خیبر کو بھی کر لے تو زیر

حضرت علیؑ کے بارے میں یہ معروف حقیقت ہے کہ انتہائی سادہ اور اس زمانے کے سب سے کمتر اناج یعنی جَو کی غذا کھاتے تھے لیکن آپ کی طاقت کا اندازہ اس واقع سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب کوشش کے باوجود خیبر کا قلعہ کئی دن تک فتح نہ ہو سکا تو رسولؐ نے آخر کار یہ ذمے داری حضرت علیؑ کے سپرد کی جنہوں نے مخالفین کے سب سے بڑے بہادر مرحب پر فتح پائی بلکہ قلعہ بھی فتح کیا کیونکہ ان کی طاقت اور بہادری کا تعلق غذا سے نہیں بلکہ ایمانی پختگی سے تھا اور ہمارے لیے سب سے بڑا سبق ہے کہ اگر ہم ایمان اور عقیدے صادق ہیں تو کامیابی ہمارا مقدر ہے۔

ہزار خیبر و صد گو نہ اژدر است اینجا
نہ ہر کہ نانِ جویں خورد حیدری داند

☆☆☆☆

ہزار خیبر و اژدر کے درمیاں میں رہوں
میں کھاؤں جَو کی بھی روٹی پر حیدری نہ بنوں

یہاں جنگ خیبر میں فتح کے علاوہ حضرت علیؑ سے منسوب ایک اور روایت کی جانب بھی اشارہ ہے کہ لڑکپن میں آپ نے ایک اژدھے کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اقبال یہاں کہتے ہیں کہ صرف جَو کی روٹی کھانے سے کوئی حیدری نہیں بن سکا، نہ خیبر کا قلعہ فتح کر سکتا ہے اور نہ ہی اژدھے کے ٹکڑے کر سکتا ہے، اس کے لیے حضرت علیؑ کے علم و عمل کی پیروی کرنا بھی لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر

ایمان میں صداقت نہیں ہوگی جس کے بغیر ہم اپنے نفس کی غلامی سے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔

گہے باحق در آمیزد، گہے باحق در آویزد
زمانے حیدری کردہ، زمانے خیبری کردہ

☆☆☆☆

کبھی ہے دین حق کے ساتھ اور دشمن کبھی اس کا
عمل ہے حیدری اس کا، عمل ہے خیبری اس کا

تاریخ کے اولین وقت سے ہی مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک وہ جن کی شان میں سورۃ مومنون آئی اور دوسرا وہ جن کا تذکرہ سورہ منافقوں میں ہے، اسی فرق کو یہاں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان کبھی تو دین حق پر فدا ہونے والے گروہ میں اس طرح شامل ہو جاتا ہے جہاں اس کی ذات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ دنیا کی کشش بے معنی ہو جاتی ہے اور وہ اپنا نفس خدا کے حوالے کر دیتا ہے جس طرح کہ فاتح خیبر حضرت علیؑ نے کیا جبکہ انہی میں دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو خیبر والوں کی طرح سرکش ہو کر اسلام دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مومن ہونے کی جگہ منافقین میں شامل ہوتا ہے۔

امیر قافلہ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلہ ما حیدری ز کرّاری است

☆☆☆☆

امیر قافلہ ہے تو تجھے تیار رہنا چاہیے
کہ حیدر کی طرح ہر جنگ میں کرّار رہنا چاہیے

یہاں اقبال کا مخاطب مسلمانوں کا وہ گروہ ہے جو حق و صداقت پر قائم ہے اور خدا کی راہ میں اپنی نفسانی خواہشات کو مکمل طور پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس پیغام کو پہنچانے کے لیے کوشاں رہتا ہے، چاہے اس راستے میں اسے کتنی ہی مشکلات، مصائب اور سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ یہی لوگ قافلہ حق کے سالار ہوتے ہیں اور خدا کی راہ میں کامیابی

حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس کا قبلہ حضرت علیؑ کی ذات ہوتی ہے جن کا علم و عمل اور بہادری ان کے لیے مشعلِ راہ اور کامیابی کی کنجی ہوتی ہے۔

من آں علم و فراست باپرِ کا ہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

☆☆☆☆

کسی قیمت میں وہ علم و فراست لے نہیں سکتا
کہ جو تیغ و سپر سے مرد غازی کو کرے غافل

کوئی بھی فرد ہو یا قوم چاہے جتنی بھی عقل رکھتی ہو یا اس کے پاس عمل کے خزانے موجود ہوں، فہم و فراست بھی ہو مگر وہ اس دنیا میں غلبہ حاصل نہیں کرسکتی کیونکہ اس کے مقابل وہ قوتیں موجود ہیں جو اس کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہیں اور دوسرے کو زیر کرسکتی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ تمام صلاحیتوں کے باوجود اگر طاقت سے محروم ہیں تو مغلوب ہی رہیں، اس لیے ایسا عمل جو مرد غازی کو بہادری کے جذبے سے بیگانہ کردے وہ بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہوجاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ علم و فراست کے ساتھ ساتھ قوت بازو کا ہونا بھی ضروری ہے۔

بہر نرخے کہ ایں کا لابگیری سود مند افتد
بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراکِ رازی را

☆☆☆☆

ہر اک قیمت پر یہ سودا بہت بہتر ہے کہ جس میں
نہ ہو گر فلسفہ رازی کا، ہو فکر علی شامل

اسلامی تاریخ میں رسولؐ کے علاوہ کچھ ایسی ہستیاں ہیں جن کے کردار و عمل کا معیار عین احکامات خداوندی کے مطابق ہے اور اس کا کچھ حصہ بھی انسان اپنی زندگی میں اختیار کرلے تو وہ مردمومن کے کردار کا عملی نمونہ بن سکتا ہے۔ یہ کسی بھی فلسفیانہ خیالات سے برتر ہوگا۔ اقبال کے خیال میں یہ اعلیٰ اور قابل تقلید کردار حضرت علیؑ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا کردار ایسا ہو کہ اگر کوئی

انسان اس کی پیروی کرلے تو یہ زیادہ فائدہ مند ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ فلسفی رازی کی باتوں پر عمل پیرا ہو۔

عشق بانان جویں خیبر کشاد
عشق درانداِم مہ چاکے نہاد

☆☆☆☆

عشق سچا نانِ جَو کھا کر بھی خیبر توڑ دے
اور کبھی یہ چاند میں بھی داغ سا اک چھوڑ دے

انسان میں اگر جذبہ عشق بیدار ہو جائے جس کا اصل مفہوم وہ عشق ہے جو خدا کی ذات سے کیا جاتا ہے جس کے بعد کسی مادی حرص وہوس سے انسان آزاد ہو جاتا ہے اور بڑی سے بڑی مشکل جو خدا کی راہ میں درپیش ہو اسے باآسانی سر کرلیتا ہے، چاہے اس کی غذا جیسی معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو جیسے کہ حضرت علیؑ کی ذات تھی جنہوں نے نان جویں پر ساری عمر گزار دی مگر جب معرکہ حق و باطل بپا ہوا تو خیبر جیسے ناقابل فتح قلعے کو بھی اپنی روحانی قوت سے فتح کرلیا اور اگر خدا سے عشق میں کمی ہو اور اس کی ذات پر مکمل یقین نہ ہو تو پورے چاند میں داغ کی مانند ہو جاتا ہے۔

کو رابینندہ از دیدار کن
بولہب را حیدر کرار کن

☆☆☆☆

بے بصارت کی طلب ہے نور کا دیدار کر
دل میں بیٹھے بولہب کو حیدر کرار کر

اگر کسی شخص کو صراطِ مستقیم کی تلاش ہے اور حق وصداقت کے راستے پر چلنے کا خواہشمند ہے تو اس کے لیے نورِ رسولؐ سے بہتر کوئی چیز نہیں کیونکہ وہی خدا کے آخری پیغام کو لے کر اس دنیا کی ہدایت کے لیے آئے تھے۔ انہی کی پیروی میں ہماری فلاح ہے جس کے ذریعے انسان کو بصارت اور بصیرت دونوں ہی حاصل ہوتی ہیں، اس لیے بجائے بولہب کی طرح گمراہ ہونے اور اپنی ذات

کو ذلت و خوار کرنے کے حیدر کرار کی طرح معرفت رسولؐ حاصل کریں اور اپنی ذات میں موجود بولہب کو ختم کر کے کامیاب و کامران ہوں۔

پیش او نہ آسماں نہ خیبر است
ضربت او از مقام حیدر است

☆☆☆☆

مثلِ خیبر ہوں اگر نو آسماں
اس کی ضربت "یاعلیؑ" وردِ زباں

اسلامی تاریخ میں حضرت علیؑ کی ذات دو خصوصیات کی بنا پر منور اور یکتا ہے۔ایک آپؑ کا علم جس کی وجہ سے رسولؐ نے انہیں باب علم قرار دیا، دوسرا ان کا ایمان جس کی وجہ سے انہیں خدا کی ذات پر اس درجہ یقین تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ان کے زورِ بازو کے آگے زیر تھی۔اسی حقیقت کی جانب اقبال اس شعر میں اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں جس میں بھی حضرت علیؑ جیسی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی اس کے سامنے نہ کسی آسمان کی کوئی اہمیت ہوگی نہ خیبر کی کوئی حیثیت ہوگی۔بس علیؑ کا کردار اس کے پیش نظر ہونا چاہیے۔

حکم حق را در جہاں جاری نکرد
نانے از جو خورد کرّاری نکرد

☆☆☆☆

بات حق کی کس لیے جاری نہ کی
جَو کی روٹی کھائی کرّاری نہ کی

عام طور سے مسلمان اسلامی تعلیمات کے اس حصے پر تھوڑا بہت علم کر کے جن کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور جن پر عمل کرنے میں اس کو اپنی نفسانی خواہشات کو ترک نہیں کرنا پڑتا سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا حق ادا کر دیا جبکہ اصل حقیقت وہ اصول ہیں جنہیں اسلام میں بنیاد بنایا گیا ہے۔ یعنی اپنے نفس کی ہر خواہش کو پس پشت ڈال کر خدا کے بنائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا اور ان

ہستیوں کی پیروی کرنا جو اس کے اصل نمائندے ہیں، اس لیے صرف حضرت علیؑ کی طرح جَو کی روٹی کھالینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی طرح کا کردار ہونا بھی ضروری ہے۔

قوی بازوے او مانند حیدر
دل او از دوگیتی بے نیازے

☆☆☆☆

شجاعت حیدر کرّار کی مولا عطا ہو
پر ان کے دل میں دنیا سے نہ کچھ وابستگی ہو

جن نوجوانوں سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ امت کو پستی کے اندھیروں سے نکال کر ترقی کی منزل کی جانب گامزن کر سکتے ہیں، ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے علم و عمل سے کردار کی بلندی کی اس منزل پر پہنچ جائیں جہاں حضرت علی حیدر کرّار تھے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی ذات اور اس کی ہدایات پر ایمان یقین کی حد تک پختہ ہو، ان کے ہر قدم اسی کے بنائے ہوئے راستے پر اٹھیں، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا نفس دنیا کی وقتی اور مادی خواہشات سے پاک نہ ہو جیسا کہ حضرت علیؑ کا تھا، یہی اقبال کی آرزو اور دعا ہے۔

گلستانے ز خاک من برانگیز
نمِ چشم بخونِ لالہ آمیز

☆☆☆☆

مری مٹی سے پیدا گلستاں کر
ان آنسوؤں سے لالہ رخ عیاں کر

اقبال دعائیہ انداز میں خدا کے حضور اپنی اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں کہ میری زندگی کو گلستاں کی طرح باغ و بہار کردے جس میں ہر رنگ کے پھول کھلے ہوں جن کی خوشبو سے تمام فضا خوشگوار ہو جائے اور فرحت کا احساس پیدا ہو جس کی وجہ سے آنکھیں جو غمِ احساس سے نمناک رہتی ہیں وہ اس منظر کے اثر سے اس طرح تر و تازہ ہو جائیں کہ ان میں تیرے نور حیات ہدایت

کے پھول کھل رہے ہوں اور یہ گل لالہ کی طرح سرخی مائل نظر آنے لگیں جس سے تیری قدرت عیاں ہو جائے۔

اگر شایاں نیم تیغِ علی را
نگاہ دہ چو شمشیر علی تیز

☆☆☆☆

اٹھا سکتا نہیں گر، تیغ حیدر
نظر، شمشیر حیدر سے رواں کر

یہ مصرعے گزشتہ شعر کا تسلسل ہیں جن میں حضرت علیؑ کے کردار اور شخصیت کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ اگر وقت اور حالات کی وجہ سے بزور تیغ زنی اپنی برتری قائم کرنا ممکن نہیں جیسا کہ حضرت علیؑ نے کیا تو ضروری نہیں کہ ایسا ہی کیا جائے کیونکہ اس میں کامیاب نہ ہونے کا اندیشہ ہے جو مستقبل کے لیے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے تو اپنے کردار کے اثر سے اپنی شخصیت کو اس درجہ بلند کر کہ لوگ تیری نظروں کے اثر سے اتنا متاثر ہوں کہ وہ حق کے ساتھ آ جائیں، اس طرح تو اپنی نظر سے تلوار کا کام لے سکتا ہے۔

اے محو ثنائے تو، زبا نہا
اے یوسف کاروانِ جا نہا

☆☆☆☆

زبانوں کے لیے تیرا بیاں ہے
تو ہی سرمایۂ ہر کارواں ہے

حضرت علیؑ کی شخصیت ایک ایسا مقام رکھتی ہے کہ ان کی محبت کا اظہار ہو یا ان سے عقیدت کا سامان وہ چاہے جتنا بھی کر لیں اس کا حق ادا نہیں ہو سکے گا۔ یہی کیفیت اقبال کی بھی ہے جس کا وہ برملا اظہار بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آپؑ کے چاہنے والوں کی زبانیں ہمہ وقت آپؑ کی ثنا میں محو رہتی اور انہیں کسی اور سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کیونکہ ان کے پاس کسی دوسرے کا تذکرہ

کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا، اس لیے صرف آپ ہی کی ذات ہے جو حق وصداقت کے چاہنے والوں کے لیے سب سے بڑے سرمایے کا درجہ رکھتی ہے۔

اے باب مدینۂ محبت
اے فوج سفینۂ محبت

☆☆☆☆

شہر الفت کا وہی ہیں راستہ
کشتیِ الفت کے وہ ہیں ناخدا

حضرت محمدؐ کی ذات سے محبت حضرت علیؑ کی شخصیت کی سب سے بڑی عظمت ہے، اسی لیے انہوں نے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں کی اور جب وقت آیا وہ آپؐ کی حفاظت کی خاطر سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہاں اقبال نے اسی محبت واخوت کو بیان کیا ہے کہ حضرت کی ذات وہ ہے کہ اگر حضور کی محبت کو شہر قرار دیا جائے تو اس میں داخل ہونے کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔ گویا آپ کی ذات شہر میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے، اسی طرح جب بھی کبھی حضرت محمدؐ سے محبت کرنے والون کو کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو آپ کی ذات نے حضرت نوحؑ کی طرح سفینہ بن کر اسے بچایا۔

اے ماحیِ نقشِ باطلِ من
اے فاتحِ خیبرِ دلِ من

☆☆☆☆

باطل کا نقش دل سے مٹا جس کی ذات سے
دروازہ میرے دل کا کھلا جس کی ذات سے

اس شعر میں اقبال حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ذاتی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں اور اپنے کردار کو حضرت علیؑ کی ذات سے منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؑ ہی کی ذات کا عمل وکردار ہے جس سے متاثر ہو کر اپنے دل میں موجود باطل کو میں شکست دے پایا اور حق کے راستے پر رواں ہوا، ورنہ تو میرے دل میں باطل ایسے موجود اور چھپا

بیٹھا تھا جیسے وہ خیبر کا قلعہ ہو جس کو آپ کے ذکر سے ایسے فتح کر لیا جیسا کہ خیبر کو فتح کر کے باطل کو شکست دی تھی۔

اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں
تفسیرِ تو سورہ ہائے قرآں

☆☆☆☆

تو رابطۂ بندہ و معبود
قرآن میں مذکور تیری صفات موجود

خدا اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے کبھی براہِ راست ہدایت نہیں کرتا بلکہ اپنے برگزیدہ بندوں کو ان کے درمیان بھیجتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو راہِ حق کا پیغام دیں۔ یہی ہستیاں پیغمبر اور نبی ہوتی ہیں جو ہدایت کا وسیلہ ہوتی ہیں، خدا ان پر بھی فرشتوں کے ذریعہ اپنا کلام نازل کرتا ہے۔ یہ ہستیاں نہ صرف اپنے کلام کے ذریعے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتی ہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کا اظہار کرتی ہیں۔ اقبال اس شعر میں اسی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ نبیوں کے بعد حضرت علیؑ ہی کی ذات وہ ہے جو خدا اور بندے کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہے اور آپؑ کا عمل قرآن کی عملی تفسیر ہے۔

اے مذہبِ عشق را نمازے
اے سینۂ تو امینِ رازے

☆☆☆☆

تو مذہبِ عشق کی نماز ہے
تیرا سینہ اسرار الٰہی کا امینِ راز ہے

علامہ اقبال نے حضرت علیؓ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار مختلف انداز اور تواتر سے کیا ہے، ان کے یہاں انسانی کردار کی بلندی کا اظہار جذبہ عشق کی صورت میں بھی ہوتا ہے جس میں وہ اپنے محبوب کے لیے ہر نفسانی خواہش کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور صرف رضائے الٰہی کے لیے

اپنی ذات کو وقف کر دیتا ہی، اسی جذبہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر عشق کوئی مذہب ہوتا تو اس کی نماز کی سب سے اعلیٰ مثال حضرت علیؑ کی ذات ہے کیونکہ عالمِ نماز میں انہیں دنیا کی کسی چیز کی نہ فکر رہتی نہ احساس کیونکہ آپ کی ذات تو اسرارِ الٰہی کا خزانہ ہے۔

اے سرِّ نبوت محمدؐ
اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ

☆☆☆☆

اے رازِ نبوتِ محمدؐ
مدحت ہے تیری مدحت محمدؐ

حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کی ذات کا تعلق اس قدر قربت کا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، سوائے نبوت کے اوصاف کے۔ دونوں ایک جان دو قلب ہیں کیونکہ حضرت کی پرورش ان کے چچا اور حضرت کے والد ابو طالب نے کی اور حضرت علیؑ پیدائش کے وقت سے ہی آپ کی ذات گرامی کی زیرِ نگرانی رہے، اسی لیے وہ نبیؐ کے اعلیٰ مقام اور ان کی ذات میں پوشیدہ رازوں سے واقف ہیں، اس سے زیادہ کوئی دوسرا ہو نہیں سکا۔ اسی طرح انہوں نے جتنا اثر قبول کیا اس کا مقابلہ بھی کسی سے نہیں۔ اسی علیؑ کی مدحت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ رسولؐ کی ہو، یہاں اقبال نے یہی ظاہر کیا ہے۔

گردوں کہ بہ رفعت ایستا دست
از بامِ بلندِ تو فتا دست

☆☆☆☆

ہے آسماں اگرچہ بلند
بام علی ہے اس سے بھی بلند

اس کائنات میں جو بلند ترین چیز کہی جا سکتی ہے وہ آسمان ہے۔ جس کی بلندی کا شمار کرنا تو در کنار اس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں، اسی لیے جب کسی مادی شے کی بڑائی یا اونچائی کا تذکرہ کرتے

ہوئے مثال دینا ہوتی ہے تو ہم آسماں سے دیتے ہیں۔ یہاں بھی اقبال حضرت علیؑ کے مقام بلند کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر چند کہ آسمان بہت دور ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہے لیکن جب وہ حضرت علیؑ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی عظمت کو وہ آسمانوں کی بلندی سے بھی زیادہ اوپر قرار دیتے ہیں جو ان کی عقیدت کا اظہار ہے۔

ہر ذرّہ در گہت چو منصور
درجوشِ ترانۂ اناالطور

☆☆☆☆

ہر ذرہ تیرے در کا ہے یوں طور کی طرح
نعرہ لگا رہا ہے وہ منصور کی طرح

کوہِ طور کی عظمت اس واقعہ سے منسوب ہے جس میں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف اپنا جلوہ کرایا بلکہ ہم کلام بھی ہوا، اسی وجہ سے انہیں کلیم اللہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اسی حوالے سے اقبال حضرت علیؑ کی شان بیان کرتے ہوئے اس شعر میں کہتے ہیں کہ آپ کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ آپ کے لیے ہر ذرہ اس طرح روشن ہے جس طرح سے کوہِ طور روشن ہے اور اسی مقصد کا حامل ہے، اس لیے جس طرح حسین بن منصور حلاج نے 'اناالحق'' کا نعرہ بلند کیا تھا اسی طرح درِعلی کی خاک کا ہر ذرہ اناالطور پکار رہا ہے جو اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

بے تو، نتواں باد رسیدن
بے او نتواں بتو رسیدن

☆☆☆☆

ہے معرفت رسولؐ کی تم سے ہی یا علیؑ
پہچان آپ کی ہے بس ان سے ہی یا علیؑ

اس شعر میں بھی علامہ اقبال نے رسولؐ اللہ اور حضرت علیؑ کی ذات کے تعلق اور قربت کو بیان کیا ہے اور دونوں کی ہستیوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا کیونکہ حضرت کی ذات

رسالت کے اسرار و رموز سے واقف تھی، اتنی کوئی دوسری ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ حضرت علیؑ کی زندگی کے پہلے دن سے لے کر رسولؐ کے آخری وقت تک وہی ہر پل ان کے زیر سایہ رہے، اسی وجہ سے حضرت کی سب سے بڑی پہچان آپ کی ذات کا حوالہ ہے اور اگر کسی کی معرفت رسول حقیقی معنی میں حاصل کرنی ہے تو اسے حضرت علیؑ کے طور طریقے پر عمل کرنا ہوگا، یہی معرفت کا اصل رستہ ہے۔

فردوس ز تو چمن در آغوش
از شانِ تو حیرتِ آئینہ پوش

☆☆☆☆

ہے زینت فردوس علیؑ آپ کے دم سے
حیرت کو بھی حیرت ہے علیؑ آپ کے دم سے

حضرت علیؑ کی ہستی اس دنیا میں رونق کا باعث ہے کیونکہ انہوں نے اپنے کردار اور علم و عمل سے انسانی اقدار کی ایسی مثالیں رہتی دنیا تک کے لیے قائم کردی ہیں کہ ان پر چل کر اس دنیا میں ایک مثالی معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ ان کی یہ برکت صرف اس دنیا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ یہاں کے بعد کی زندگی تک پھیلا ہوا ہے، اسی کا اظہار اقبال نے اس شعر میں کیا ہے کہ جنت فردوس کے چمن میں بھی رونق ہوگی، وہ بھی آپ ہی کی ذات کے باعث ہوگی کیونکہ آپ کی شان اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ سوچنے والا بھی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

جانم بغلامی تو خوشتر
سر برزدہ ام زجیب قنبر

☆☆☆☆

جاں تیری غلامی پر ہے اس طرح سے شاد
جیسے دل قنبر میں تو ہی ہے آباد

یہ خواہش انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ دوسروں پر اقتدار حاصل کر سکے، اس کو اپنا دست نگر بنالے مگر خدا نے کچھ ہستیاں اس دنیا میں ایسی بھی بھیجیں جو کردار میں اس بلندی پر فائض ہوتی ہیں

کہ بڑے سے بڑا آدمی بھی ان کی غلامی کو اعزاز سمجھتا ہے اور اس کا برملا اظہار کر کے فخر محسوس کرتا ہے، ان عظیم ہستیوں میں حضرت علیؓ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اقبال اس شعر میں اسی امر کا فخریہ اظہار کر رہے ہیں کہ میں دل و جان سے اس کی خواہش رکھتا ہوں کہ آپ کی غلامی میں آ جاؤں اور میرے دل کی ہستی اس سے آباد ہو جائے جیسے کہ قنبر کے دل میں تھی اسی سے میں خوش ہوں گا۔

ہشیارم و مست بادۂ تو
چوں سایہ زپا فتادۂ تو

٭٭٭٭

شراب عشق سے تیری یوں ہوشیار ہوں میں
کہ سایہ بن کے کف پائے تو نثار ہوں میں

علامہ اقبال حضرت علیؓ کی ذات کے عشق میں اس طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہونے کو تیار ہیں اور جتنا ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، ان کی خواہش میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے کہ وہ مزید قربت کا فیض حاصل کریں، اسی خواہش کا اظہار یہاں اس طرح کر رہے ہیں کہ میں آپ کے عشق کی شراب پی کر اس قدر مست ہو گیا ہوں کہ میں بے خبر ہونے کے بجائے زیادہ ہوشیار ہو گیا ہوں اور اسی کیفیت میں میری یہ کوشش ہے کہ میں آپ کے نقش قدم پر چلوں جیسے کسی کا سایہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، یہی میرے لیے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

از ہوش شدم، مگر بہوشم
گوئی کہ نصیریؔ خموشم

٭٭٭٭

یہ بیخودی عشق ہے گویا بس ہوش
لب بند ہیں اور ترا نصیری خاموش

جب کوئی شخص کسی شخصیت کی محبت کی بلند ترین منزل تک پہنچ جاتا ہے تو وہ عقیدت کی شکل

اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب اس ہستی کے اصل مقام کا اسے پوری طرح ادراک ہو جاتا ہے اور اس کے سحر میں اس طرح مبتلا ہو جاتا ہے کہ جہاں کی نظر میں کسی دوسرے کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، اسی کیفیت کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے۔ اقبال حضرت علیؑ سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں آپ کی محبت میں اپنے ہوش کھو چکا ہوں مگر یہی میرے ہوش میں آنے کی اصل حالت ہے مگر کیا کروں کہ میں نصیری ہونے کے باوجود خاموش ہوں کیونکہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔

دائم کہ ادب بضبطِ راز است
در پردۂ خاموشی نیاز است

☆☆☆☆

یہ جانتا ہوں پاس ادب راز ہی تو ہے
پردہ جو خاموشی کا ہے وہ نیاز ہی تو ہے

جذبہ محبت اور عشق حقیقی کے لیے جو معیار ہے اس کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس کو دوسرے سے پوشیدہ رکھا جائے اور کسی کی سامنے آشکارہ نہ کیا جائے کیونکہ اس کی شدت میں کمی آ جاتی ہے اور یہ عاشق و محبوب کا راز نہیں رہتا، یہاں تک کہ سچی عبادت بھی وہی کہلاتی ہے جو تنہائی میں کی جاتی ہے جس میں خالق و مخلوق کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ یہی حقیقت اس شعر کا مفہوم ہے۔ اقبال کے خیال میں حضرت علیؑ سے عقیدت و محبت اور ادب و لحاظ کا تقاضہ یہ ہے کہ میں اسے راز ہی رکھوں اور پردہ خاموشی میں اپنی نیاز مندی کا اظہار کرتا رہوں۔

لنا چہ کنم مئے تولا
تند است بروں فتد زمینا

☆☆☆☆

بیخود ہوا ہوں مئے تولا سے
ہے اس کا نشہ زیادہ مینا سے

انسان جب کسی شخصیت کی محبت سے اتنا سرشار ہو جاتا ہے کہ دنیا کی ہر شے اس کی نظر میں کم اور بے معنی لگنے لگتی ہے تو ایک کیف و مستی کی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے، دنیا کی کوئی چیز اس پر حاوی نہیں ہو پاتی ہے۔ اقبال حضرت علیؑ سے عقیدت میں اسی منزل پر تھے، ان کی نظر میں جو مقام حضرت علیؑ کا تھا وہ کسی دوسرے فرد کا نہیں تھا۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ میں آپ کی محبت کی پاکیزہ شراب پی کر اس درجہ بیخود ہو گیا ہوں کہ محسوس ہوتا ہے کہ مینا بھی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اس طرح بے خبر نہیں کر سکتی۔

ز اندیشۂ عافیت رہیدم
جنسِ غمِ آل تو خریدم

٭٭٭٭٭

غم آل مرتضیٰ کا یوں حد سے سوا ہوا
کہ عافیت کا خوف بھی کوئی نہیں رہا

دنیا کی تاریخ میں رسولؐ اور آل رسول کا جو مرتبہ ہے اس کا کوئی دوسرا مقابلہ نہیں کیونکہ یہ ہستیاں ایمان اور یقین کی جس منزل پر فائز ہیں اس تک پہنچنا کسی کے بھی بس میں نہیں۔ انہوں نے جس طرح حق کے لیے باطل کا مقابلہ کیا اور نہ صرف قربانیاں پیش کیں بلکہ حق کی راہ میں ہر قسم کے مصائب کا سامنا کیا، اسی لیے ان کا غم آفاقی پیغام اور اعلیٰ کردار کی مثال بن گیا۔ اقبال بھی اس غم میں شرکت کو اپنے لیے اعزاز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اس میں اس طرح شریک ہو گیا ہوں کہ اب مجھے دنیا کا کوئی خوف نہیں، یہاں تک کہ آخرت کا خوف بھی جاتا رہا ہے۔

فکرم چو بہ جستجو قدم زد
در دیر شدو در حرم زد

٭٭٭٭

میرا خیال ان کی طلب میں نکل پڑا
دیر و حرم میں ڈھونڈتا ان کو میں چل پڑا

جو لوگ حق کے متلاشی ہوتے ہیں ان کی کوئی سمت یا منزل متعین نہیں ہوتی بلکہ جہاں بھی اس کا امکان ہوتا ہے وہ اسی جانب چل پڑتے ہیں، اسی طرح وہ تلاش حق میں مختلف جگہوں میں جستجو کو جاری رکھتے ہیں، تاوقت کہ وہ اس کے قریب نہ پہنچ جاتے مگر کیونکہ حقانیت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے تو اپنی اس تلاش کی جدوجہد سے دستبردار ہوکر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ کسی دوسری منزل کی جانب بڑھ جاتے ہیں۔ اس میں ان کے مدنظر کوئی مخصوص جگہ نہیں ہوتی۔ دیر ہو یا حرم وہ دونوں میں ایک ہی طرح سے حق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اقبال نے یہاں یہی ظاہر کیا ہے۔

در دشتِ طلب بسے دویدم
داماں چوگرد باد چیدم

دشت طلب میں ان کو ہی ڈھونڈا ابھی تلک
پھرتا رہا ہوں مثل بگولا ابھی تلک

اس شعر کا مضمون و مفہوم کم وبیش وہی ہے جو پہلے والے کا ہے، سوائے اس کے کہ انداز و الفاظ بدل گئے ہیں۔ اقبال کے مطابق تلاش حق میں فاصلے یا کوئی دوسری مشکل رکاوٹ نہیں بن سکتی اور جو لوگ اس جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں وہ ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہتے ہیں، اسی لیے دشت و صحرا کی وسعت اور ناموافق حالات ان کے ارادوں کو کمزور نہیں کر پاتے ہیں نہ ہی ان پر ان کا کوئی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ بگولے کی طرح سے فضاؤں میں بلند ہوکر اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتے ہیں جو ان کے ایمان کی استقامت کا ثبوت ہے۔

در آبلہ خارہا خلیدہ
صد لالہ تہِ قدم دمیدہ

چلتا رہا ہوں خاروں پہ میں آبلوں کے ساتھ
لالے کو خوں دیا ہے مگر حوصلوں کے ساتھ

اس شعر میں اقبال راہِ حق پر چلنے والوں کی مشکلات کا بیان کر رہے ہیں کیونکہ اس دنیا میں جہاں حق و صداقت کے علمبرداروں کی تعداد انتہائی محدود ہے اور باطل کی حمایت اور منافقین اکثریت میں ہیں، اسے میں سچائی کی آواز کو بلند کرنا کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں سے بھری راہ گزر ہے جس پر چلنے والوں کو آبلہ پائی کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہے اور کانٹوں کی راہ سے گزرنا بھی پڑتا ہے جس کی وجہ سے ان کے خون سے راہوں پر سیکڑوں گل لالہ کھل اٹھتے ہیں مگر وہ پھر بھی اپنا سفر جاری و ساری رکھتے ہیں۔

افتادہ گرہ بروئے کارم
شرمندۂ دامن غبارم

کوشش میری ہوئی نہ ابھی تک بروئے کار
مجھ سے نہ چھٹ سکا ہے ابھی دامن غبار

جب سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے اسی وقت سے یہاں حق و باطل کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ خدا نے حق کے قیام کے لیے نبی اور پیغمبر بھیجے لیکن انسان اپنی روش پر ہی قائم رہا اور آج تک ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عام انسانوں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جو خدا کے پیغام حق کے قیام کی جدوجہد میں مصروف رہے، انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے مگر یہ عمل نامکمل ہی رہتا ہے۔ اقبال بھی انہی افراد کے گروہ کا حصہ ہیں لیکن وہ بھی اس امر کا اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے کہ تمام تر جدوجہد کے باوجود وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اغیار کا پردہ چاک نہ کر سکے۔

پویاں پے خضر سوئے منزل
بردوشِ خیال بستہ محمل

☆☆☆☆

ایسے میں خضر راہ نے ہمت بڑھائی ہے
منزل ابھی خیال میں مجھ کو دکھائی ہے

قدرت نے اس دنیا میں ایسا نظام وضع کیا کہ جب کوئی شخص حق کی تلاش یا اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کررہا ہوتا ہے اور اس کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو کامیابی نہیں مل رہی ہوتی جس کی وجہ سے اس کے حوصلے پست ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور وہ مایوسی کا شکار ہونے لگتا ہے تو کوئی نہ کوئی اسے سہارا مل جاتا ہے اور وہ مایوسی کی کیفیت سے باہر آجاتا ہے۔ اسی خیال کو یہاں بیان کیا گیا ہے کہ جب مایوسیوں کی وجہ سے حوصلے ٹوٹنے لگے تو کوئی ہستی خضر راہ بن کر آئی اور رہنمائی کی اس حوصلہ افزائی کی بدولت حق کی منزل دوبارہ نظر آنے لگی۔

جویائے   مے   و   شکستہ   جامے
چوں   صبح   بباد   چیدہ   دامے

☆☆☆☆☆

مے کی طلب تھی اور میں ٹوٹا سا جام تھا
جیسے بنا نسیم، سحر کا ہنگام تھا

یہاں اقبال انفرادی واجتماعی صورتحال کا بیان کررہے ہیں اور قوم کی حالت زار بتارہے ہیں جسے نہ اپنی بے سروسامانی کا احساس ہے اور نہ ہی ترقی کرنے کی خواہش جس کی وجہ سے وہ مسلسل تنزلی کا شکار ہے اور دوسری قومیں اس پر غلبہ حاصل کیے جارہی ہیں اور ہم غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ پیاس کے مارے شراب پینے کی خواہش تو ہورہی ہے لیکن اس کو پورا نہیں کرسکتا، اس لیے کہ میرا جام ٹوٹا ہوا ہے جس کی وجہ سے شراب گرجائے گی یا اس صبح کی طرح جس میں بادِ سحری نہ چل رہی ہو اور حبس کا عالم ہو۔

پیچیدہ   بخود   چو   موجِ   دریا
آوارہ   چو   گرد   بادِ   صحرا

☆☆☆☆☆

میں مضطرب تھا دریا کی موجوں کی شکل میں
آوارہ پھر رہا تھا بگولوں کی شکل میں

جو قومیں اپنی بے عملی کی وجہ سے ترقی کی راہ سے دور ہو جاتی ہیں ان کا اقوامِ عالم میں عزت و مقام نہیں ہوتا اور وہ مسلسل پستی میں رہنے پر مجبور ہو جاتی ہیں لیکن انہی میں ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو اس حالت زار کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جس قوم کا حصہ ہیں وہ بھی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرے، اسی جذبے کے تحت وہ مضطرب اور بے چین رہتے ہیں، اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کہ دریا کی موجیں ہوتی ہیں کہ کسی لمحے ٹھہراؤ نہیں ملتا یا صحرا میں بگولے کی طرح ہوتے ہیں جو ہوا کے ساتھ پورے صحرا میں آوارہ گھومتا رہتا ہے۔

واماندہ زِ دردِ نارسیدن
در آبلۂ شکستہ دامن

☆☆☆☆

اک درد ناامیدی فقط میرے پاس تھا
بس اب شکستہ پائی تھی اور رنج و یاس تھا

اقبال یہاں اپنے اطراف کی سیاسی، معاشرتی، معاشی، علمی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنے کے بعد کی کیفیت کا بیان کر رہے ہیں کیونکہ جدھر بھی نظر پڑتی ہے وہاں سوائے پستی اور بے عملی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا، نہ اپنی حالت کا احساس، نہ کسی ترقی کی خواہش کا اظہار، ایسے میں کیا امید کی جاسکتی ہے اور مستقبل کے بارے میں بہتری کا خیال آسکتا ہے جو اقبال جیسے حساس شخصیت کے لیے سوائے دکھ و مایوسی کا باعث نہ ہو تو اور کیا ہو، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ان حالات میں میرے پاس ناامیدی و حسرت و یاس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

عشق تو دلم ربود ناگاہ
از کار گرہ کشود ناگاہ

☆☆☆☆

ناگاہ ان کے عشق نے یوں کرلیا اسیر
راہِ طلب میں بن گیا وہ میرا دستگیر

جب افراد و اقوام کو اپنی پسماندگی کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ کسی ایسے رہنما کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی ہیں جو نہ صرف ان کی رہنمائی کر سکے بلکہ وہ اس جدو جہد کا عملی اور مثالی کردار بھی ہو جس کے نقش قدم پر چل کر پستی کے اندھیروں سے صرف نجات پائی جا سکے بلکہ روشنی کے سفر پر بھی گامزن ہو جائیں۔ اقبال کے خیال میں یہ مثالی کردار حضرت علیؓ کا ہے جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ناامیدی اور مایوسی کے عالم رنج و الم میں مجھے آپ کی محبت نے یک دم اپنا اسیر کر لیا اور مجھے وہ دستگیر اور رہنما مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی، اب مجھے امید کی روشنی نظر آنے لگی۔

آگاہ ز ہستی و عدم ساخت
بت خانۂ عقل را حرم ساخت

٭٭٭٭٭

اس نے حیات و موت سے یوں آشنا کیا
بت خانۂ خرد کو میرا رہنما کیا

ہماری تاریخ میں اقبال جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت و عقیدت رکھتے تھے ان میں حضرت محمدؐ کے بعد حضرت علیؓ کی شخصیت ہے، وہ ان سے اس حد تک عشق کرتے تھے کہ جب کسی کی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ آپ کی جانب ہی رجوع کرتے جس کا برملا اظہار اپنی شاعری میں انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ یہی اظہار یہاں بھی کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ ہی کی وہ ذات ہے جس کے ذریعے سے میں نے حیات کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی بلکہ عدم کی معلومات بھی انہی کی ذات سے ملیں جس کی وجہ سے میرا بت خانۂ عقل حرم کی طرح پاک ہو گیا۔

سرمست شدم ز پا فتادم
چوں عکس ز خود جدا افتادم

٭٭٭٭٭

سرمست ہو کے پیروں سے بے قابو ہو گیا
مانند عکس اپنے ہی میں خود سے کھو گیا

حضرت علیؓ کے عشق میں اقبال اس حد تک ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اپنی ہر کیفیت کو انہی سے منسوب کرتے ہیں، وہ عشق کی اس منزل پر اپنے آپ کو محسوس کرتے جہاں ان کے دل و دماغ میں سوائے حب رسولؐ و علیؑ کے کسی اور کی گنجائش نہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ آپ کی عقیدت و محبت میرے دل میں اس طرح سے داخل ہوگئی ہے جیسے کہ آسمانی بجلی (برق) پلک جھپکتے گزر گئی ہے اور میرے دل کو روشن کردیا جس کی وجہ سے میرا دل اس سوز و گداز سے واقف ہوگیا جو آپ سے محبت کے لیے لازمی ہے جس کی وجہ سے لذت ایمان و یقین سے آشنا ہوا۔

پیراہن ما دمن دریدم
چوں اشک زچشم خود چکیدم

☆☆☆☆☆

پیراہن خودی کو بدلنا پڑا مجھے
آنکھوں سے اشک بن کے ٹپکنا پڑا مجھے

زندگی میں انسان کو انفرادی ہو یا اجتماعی طور پر کسی نہ کسی ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرے۔ یہی نہیں بلکہ خود اپنے کردار و عمل سے اپنے آپ کو اس ذمے داری کا اہل ثابت کرے جس کے لیے علم و عمل میں یکسانیت ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر ہر کوئی پورا نہیں اترتا۔ اقبال کی نظر میں یہ حضرت علیؑ کی ذات ہے، اسی لیے وہ بیان کرتے ہیں کہ جب سے میں نے آپ کی معرفت کی شراب کا جام پیا ہے میری زندگی میں انقلاب برپا ہوگیا ہے۔ اب میرا خیال کبھی باطل کی طرف جاتا ہی نہیں ہے، میرا دل حق کی روشنی سے منور ہوگیا ہے۔

چوں برق بخرمنم گزر کرد
از لذتِ سوختن خبر کرد

☆☆☆☆☆

گزرا وہ برق بن کر میرے دل کے ساز سے
اور آشنا کیا مجھے سوز و گداز سے

یہ مشاہدہ ہم میں سے اکثر نے کیا ہوگا کہ جب کوئی شخص عالم سرور میں ہوتا ہے تو اس کو اپنے قدموں پر قابو نہیں رہتا، وہ دنیا اور ارد گرد کے ماحول سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور اسے کسی چیز کی فکر نہیں رہتی۔ ضروری نہیں کہ یہ کیفیت صرف دنیاوی سرور میں ہی ہو، یہ عشق حقیقی کی اس منزل پر بھی ہو جاتی ہے جہاں سوائے حق کے باقی ہر شے بے معنی ہو جاتی ہے، اسی کو شرابِ ولایت کہتے ہیں۔ یہ کیف و مستی کی کیفیت اقبال کی زندگی کا بھی حصہ تھی جو حضرت کی عقیدت کا اظہار تھا، ان کے قدم بھی صرف اس راہ کی جانب بے قابو اٹھتے تھے، ان کی ذات بھی اسی عقیدت میں گم ہو گئی تھی۔

برباد متاعِ ہستیم داد
جائے زمئے حقیقتم داد

☆☆☆☆

باطل مٹا کے نیک متاع کا دیا پیام
بخشا ہے آپ ہی نے مجھے معرفت کا جام

کوئی شخص جب کسی کے عشق میں ڈوب جاتا ہے تو اپنی زندگی کے ہر عمل کو اس ہستی کی مرضی اور منشا کا طابع کر لیتا ہے جس سے اسے عشق ہو جاتا ہے اور جب یہ عشق حقیقی کا معاملہ ہو تو پھر انسان اپنی ہستی کو اس طرح ڈھال لیتا ہے جس میں اس کی زندگی کا ہر شعبہ صرف اور صرف اس کے محبوب حقیقی کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی اپنی ذات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اس طرح کا کردار بن جاتا ہے جس میں انا اور خودی نام کو نہیں رہتی، وہ محبت و عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے جس کا اظہار اس کے آنسوؤں سے ہوتا ہے۔

خاکم بفرازِ عرش بُردی
زاں را کہ بادلم سپردی

☆☆☆☆

رفعت ملی یہ خاک کو وہ عرش تک گئی
واں جا کے میرے قلب کو یہ پھر سے مل گئی

جب ہم اپنے ایمان کو ایسی ہستیوں سے وابستہ کر لیتے ہیں جن کا شمار خدا کے پسندیدہ ترین بندوں میں ہوتا ہے اور وہ محبت وعقیدت کے اس معیار پر فائز ہوتے ہیں جس کی مثال دی جاتی ہے تو ان کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے اعمال بھی ایسے ہو جاتی ہیں جو ان سے مزید قریب کر دیتے ہیں۔ ایسی ہی ہستیوں میں اقبال کے خیال میں حضرت علیؑ کا مقام سب سے بلند ہے، اسی عقیدت کا اظہار وہ اس شعر میں کر رہے ہیں کہ آپ سے محبت کی وجہ سے مجھ خاکی کو وہ مقام ملا کہ میری خاک عرش کی بلندیوں تک پہنچ گئی اور جب میں وہاں پہنچا تو یہ دوبارہ میرے دل کو مل گئی۔

واصل بکنار کشتیم شد
طوفانِ جمالِ زشتیم شد

☆☆☆☆

کشتی روح اب تو کنارے پر لگ گئی
اچھائیوں میں میری برائی بدل گئی

با کردار افراد زندگی بھر اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہتے ہیں تا کہ اگر ان میں جہاں کہیں کمزوری کا امکان ہو اسے دور کر کے زندگی کو بہتر سے بہتر سانچے میں ڈھال سکیں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے وہ اپنے لیے کسی ایسی ہستی کو اعلیٰ کردار کا نمونہ بناتے ہیں تا کہ اس کے کردار کی روشنی میں اپنی اصلاح کر سکیں۔ اقبال کے لیے یہ حضرت علیؑ کی ذات تھی جس سے وہ ہدایت کے طلب گار رہتے تھے، اسی کا اظہار وہ یہاں کر رہے ہیں کہ یہ آپ ہی کی معرفت کا اعجاز ہے کہ میرے کردار میں جو کمزوریاں تھیں، وہ آپ کی پیروی میں اچھائی اور قوت ایمانی میں بدل گئیں۔

جز عشق حکایتے ندارم
پروائے ملامتے ندارم

☆☆☆☆

مدح علیؑ کا عشق فقط میرے پاس ہے
دنیا سے کچھ گلہ ہے نہ خوف و ہراس ہے

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انسان اس پر غور کرتا ہے کہ اس نے گزارے ہوئے وقت میں کیا حاصل کیا، اسے قدرت کی طرف سے یہاں بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ آیا اس نے کس حد تک پورا کیا۔ یہ وقت جب آتا ہے جب وہ یہ احساس کرنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی کی ناؤ اب کنارے لگ رہی ہے اور عرصہ حیات بہت زیادہ نہیں رہ گیا، اس شعر میں اقبال اسی کیفیت کو بیان کرر ہے ہیں کہ اب جب کہ میں زندگی کے اس مرحلے تک پہنچ گیا ہوں جہاں سرمایہ حیات کا جائزہ لوں تو میرے خزانے میں سوائے عشق علیؑ کے کچھ موجود نہیں اور اس پر کتنی ہی ملامت کی جائے کوئی پروا نہیں بلکہ فخر ہے نہ کہ خوف۔

از جلوۂ عام بے نیازم
سوزم، گریم، تپم، گدازم

دنیا کے حسن و ناز سے اب بے نیاز ہوں
بس آپ ہی کے عشق کا سوز و گداز ہوں

قدرت نے انسانی جبلت اس طور تشکیل کی ہے کہ مختلف خواہشات کا حصول اس کا حصہ ہے۔ یہ خواہش مادی بھی ہو سکتی ہین اور روحانی بھی، ان کی کوئی حد بھی مقرر نہیں کی جا سکتیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک حد تک یہ مل جاتی ہیں تو مزید حاصل کرنے کی کوشش عروج پر ہوتی ہے۔ یہ کیونکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے جوں جوں ایک طرح کی خواہشات پوری ہونے لگتی ہیں تو دوسری سے بیگانگی ہونے لگتی ہے۔ یہی صورت حال اقبال کی ہے۔ وہ کہتے ہیں حضرت علیؑ کی شخصیت و کردار کے جلوؤں کی وجہ سے میں دنیا کی ہر شے سے بے گانہ ہو گیا ہوں اور اب اسی عشق میں مجھے جلنا، تڑپنا اور پگھلنا ہے۔

مدحت فاطمہؑ

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

☆☆☆☆

نسبت عیسیٰ ہے بس مریمؑ کی عظمت کا سبب
جبکہ زہراؑ کو ملا ہے سہ گنا احسانِ رب

ہم اگر معاشرے میں قابل عزت ووقار ہستیوں کا جائزہ لیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ جو شخصیات اس درجہ پر پہنچتی ہیں اس کی مختلف وجوہ ہوتی ہیں۔کوئی اپنے ہنر کی وجہ سے عزت پاتا ہے تو کوئی اپنے کردار اور اخلاق کی وجہ سے ہر دل عزیز ہوتا ہے۔کسی کا مقام اس کے علم وعمل کی وجہ سے بلند ہوتا ہے، انہی وجوہات میں ایک کسی ہستی کی خاندانی نسبت بھی ہوتی ہے، اسی حوالے سے اقبال نے اس شعر میں حضرت مریم کی مثال دیتے ہوئے حضرت فاطمہ سے تقابل کیا ہے کہ حضرت مریم کی نسبت تو ایک حضرت عیسیٰ سے ہے جبکہ حضرت فاطمہ کی نسبت تین قابل عزت واحترام ہستیوں سے ہے۔

نور چشم رحمتہ اللعالمین
آں امام اولین و آخرین

☆☆☆☆

آپ ہی ہیں نورچشم رحمت اللعالمیں
جو ہیں بے شک بس امام اولین و آخریں

آج تک اس دنیا میں جتنے بھی انسان آئے ہیں ان کا مرتبہ ومقام مختلف ہوا ہے، کوئی عام انسان ہوتا ہے تو کسی کا مرتبہ دوسروں سے بلند ہوتا ہے اور خدا کے منتخب بندے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ واجب احترام ہستی آخری رسول حضرت محمدؐ کی ہے اور جو شخصیت آپؐ کے سب سے قریب ہو یا آپؐ اس سے قریب ہوں اس کے دراجات کس قدر بلند ہوں گے، اس کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے، اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اقبال محترمہ فاطمہ زہرا کی عظمت کی پہلی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو ہستی عالمین کے لیے رحمت اور آخری

نبیؐ ہیں حضرت فاطمہ ان کی آنکھوں کا نور ہیں جس سے ان کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آں کہ جاں در پیکر گیتی دمید
روزگارِ تازہ آئیں آفرید

☆☆☆☆

زندگی کو جس نے زندہ کردیا
فرد کو آئیں کا بندہ کردیا

یوں تو دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان کا بنیادی مقصد ایک بہتر انسانی معاشرے کا قیام ہے، ان میں نیکی و بدی کی نشاندہی کی گئی ہے تا کہ انسان ان پر عمل کر کے ایک مثالی معاشرہ قائم کرے لیکن ان میں زندگی کے تمام شعبوں جن میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور دیگر شعبوں کے مسائل سے متعلق رہنما اصول بنائے گئے ہیں۔ اسلام اسی حوالے سے ان سب سے مختلف اور ترقی یافتہ ہے کہ اس میں تمام شعبوں کے لیے رہنما اصول موجود ہیں بلکہ خود پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیؐ، ان کے اہل بیت، صحابہ اور بعد میں آنے والے اولیاء کرام عملی طور پر ان اصولوں پر عمل کرنے کا عملی نمونہ ہیں، اس شعر کا یہی مفہوم ہے کہ آپؐ نے اس دنیا میں آ کر انسانیت کے تن مردہ میں زندگی پیدا کر دی اور قیامت تک کے لیے آئین دے دیا۔

بانوئے آں تاجدارِ ھل آتی
مرتضٰی مشکل کشا شیرِ خدا

☆☆☆☆

فاطمہ زوجہ ہیں اس کی جو کہ ہے شیر خدا
تاجدارِ ھل اتیٰ مشکل کشا اور مرتضٰی

حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول خدا کی عظیم شخصیت کا تعارف علامہ اقبال مولائے کائنات کے حوالے سے یوں کراتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کی زوجہ ہیں جو سورہ الدھر میں مذکور نعمتوں کے پوری طرح مستحق ہیں، ایک پسندیدہ شخصیت ہیں، ہر مشکل کو آسان بنانے والے ہیں اور شیرِ خدا یعنی

دنیا میں سب سے زیادہ شجاع اور بہادر ہیں۔

بادشاہ و کلبۂ ایوانِ او
یک حسام و یک ذرہ سامانِ او

☆☆☆☆

شاہ انسانوں کے جو اور مومنوں کے ہیں امام
ان کے گھر کا کل اثاثہ اک ذِرہ اوراک حسام

عام طور پر دنیا میں کسی فرد کی عزت ووقار اس کی مادی حیثیت متعین کرتی ہے جس میں اقتدار سے لے کر اس کے مالی اسباب بھی شامل ہوتے ہیں مگر تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ یہ تمام عزت ووقار وقتی ہوتے ہیں جن کا عرصہ بہت مختصر ہوتا ہے اور یہ انسان کے اس دار فانی سے کوچ کرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں مگر کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جو چاہیں حاصل کر سکتی ہیں مگر ان کے لیے یہ مادی اور وقتی اشیاء بے معنی ہوتی ہیں اور وہ اپنی روحانی طاقت اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے دائمی عزت ووقار کی حامل ہوتی ہیں، اسی حقیقت کو اقبال نے حضرت علیؑ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ وہ جو دنیا اور امت کا بادشاہ ہے اس کا کل اثاثہ صرف ایک ذرہ اور تلوار ہے مگر اس کی عقیدت کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

در بیان امام حسنؑ

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

☆☆☆☆

ماں ہیں اس کی جو کہ ہے پرکار عشق
اس کی ماں جو کارواں سالار عشق

کسی بھی شخصیت کے لیے اس سے زیادہ اطمینان اور سکون کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی پہچان خود اپنی ہستی کے علاوہ اولاد کی طرف سے بھی اس کا تعارف ہو، یہی اس کی کامیابی اور تعلیم و تربیت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے اور جب یہ حضرت فاطمہ زہرا کے حوالے سے ہو جو خود رسولؐ کے قول کے مطابق جگر گوشہ رسولؐ اور خاتون جنت ہیں تو وہ واسطے کس قدر اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے جس کا اشارہ اقبال کے اس شعر میں نظر آتا ہے، جب وہ کہتے ہیں کہ آپ حسنین یعنی امام حسن اور امام حسین کی ماں ہیں جن میں ایک اللہ کے عاشقوں کا مرکز ہیں اور دوسرے کارواں کے سالار اعظم ہیں۔

آں یکے شمع شبستانِ حرم
حافظ جمعیت خیر الامم

☆☆☆☆

ہیں حسن شمع شبستان حرم
ہے تحفظ میں انہی کے امت خیر الامم

تاریخ اسلام میں ایسی چند ہی شخصیات ہوں گی جو اگر نہ ہوتیں تو انسانی دور میں ہی مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جاتا اور اسلام کے سنہری اصول لوگوں کے ذہنوں میں نہیں رہتے۔ انہوں نے اپنے قول و فعل سے ان کو تازہ رکھا اور ان کا عملی مظاہرہ کیا۔ اس کے لیے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے حق سے بھی دستبردار ہو گئے۔ اگر آنے والے وقت میں ان جذبوں پر کاربند رہا جاتا تو آج امت جس انتشار، گروہ بندی اور پستی میں مبتلا ہے نہ ہوتی، انہی ہستیوں میں ایک امام حسن جو پنجتن کے چوتھے رکن اور رسولؐ اللہ کے قول کے مطابق دوسردار

جواناں جنت میں سے ایک ہیں کو اقبال خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ایمان کی وہ شمع ہیں جس سے حرم کے اندھیرے دور ہوئے اور آپ ہی امت رسولؐ کے محافظ ہیں۔

تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشتِ پا زد بر سرِ تاجِ نگیں

☆☆☆☆☆

سرد کی اس طرح اس نے آتش جنگ و عناد
تاج کو ٹھکرا دیا، ہونے نہ پائے تا فساد

مسلمانوں کی تاریخ کا اگر ایک طائرانہ جائزہ لیں تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ماسوائے ابتدائی دو ڈھائی عشروں کے وہ دنیاوی حرص و ہوس میں مبتلا ہو گئے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ دین صرف عبادت کی حد تک محدود ہے جبکہ اسلام تو زندگی کے ہر شعبے اور پہلو کا احاطہ کرتا ہے جس میں انسان کا ہر عمل خدا کے احکام کا طابع ہوتا ہے اور ذاتی و نفسانی خواہشات کی گنجائش کم ہے اور امت کا اتحاد اولین حیثیت رکھتا ہے، ہماری تاریخ میں امام حسینؑ شاید وہ واحد مثال ہوں گے جنہوں نے اس اتحاد اور فساد کو رفع کرنے کی خاطر حاصل شدہ اقتدار سے دستبرداری اختیار کی۔ یہی اس شعر کا مفہوم ہے کہ آپ نے صلح کر کے تاج و تخت کو ٹھکرا دیا تا کہ فساد کی آگ نہ بھڑک سکے۔

واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوت بازوئے احرارِ جہاں

☆☆☆☆☆

دوسرے زہرا کے بیٹے ہیں حسین ابن علیؑ
مقصد احرار کو جن کے سبب طاقت ملی

عظمت کے جتنے حوالے اور واسطے حضرت فاطمہ زہرا کے ہیں، کسی دوسری ہستی کے نہیں ہو سکتے۔ خود ان واسطوں کی عظمت کا بیان بجائے خود ممکن نہیں ان کی والد اللہ کے آخری نبی اور عالمین کے لیے رحمت ہیں۔ ان کے شوہر بقول اقبال مسلم اول اور ہر مشکل وقت میں رسولؐ اللہ کے شانہ بشانہ کھڑے رہنے والے، بیٹے جن کو رسولؐ نے اپنا بیٹا قرار دیا اور انہی سے رسولؐ اللہ کی

نسل چلی۔ انہی عظمتوں کا ذکر اقبال نے بار بار کیا ہے۔ امام حسینؓ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا کے دوسرے بیٹے پورے جہاں کے حق پرستوں کے رہنما ہیں جن کے ایثار اور قربانیوں کے واقعات سے حریت پسند اپنے حوصلے بڑھاتے ہیں۔

ذر نوائے زندگی سوز از حسین
اہل حق حریت آموز از حسین

☆☆☆☆

سوز مولا کا ہے سازِ زندگی کے واسطے
کربلا تمثال رازِ زندگی کے واسطے

امام حسینؓ کی ذات اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جب تاریخ میں پہلی بار اسلام کے نظام حیات کو تبدیل کر کے وراثت کی بنیاد پر حاکم مقرر کیا جانے لگا جو خلافت کے بنیادی نظریہ سے پہلی روگردانی تھی تو کسی نے بھی اس کے خلاف آواز حق بلند نہیں کی، سوائے امام حسینؓ کے جنہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وقت آنے پر اپنے تمام اہل خانہ و احباب کے ساتھ اس کے خلاف کربلا کے میدان میں سینہ سپر ہو گئے اور لازوال قربانی پیش کی۔ اقبال کے خیال میں امام حسینؓ کا غم جہاں ایک طرف زندگی کو سنوارنے کا ذریعہ ہے تو دوسرا رخ یہ اہل حق اور حریت پسندوں کے لیے سبق آموز اور قابل تقلید کردار بھی ہے۔

سیرتِ فرزند ہا از امہات
جوہر صدق و صفا از امہات

☆☆☆☆

سیرت فرزند میں ماں کا بہت کردار ہے
جوہر صدق و صفا بس اس کا ہی اظہار ہے

دنیا میں اولاد پر جس ہستی کے کردار و عمل کے سب سے زیادہ اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ ماں ہوتی ہے کیونکہ بچے سب سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتے ہیں، وہ اپنے ہی طریقے سے ان کی تربیت کرتی ہے، اس کی عادات و اطوار بچوں کے لیے عملی نمونہ ہوتی ہیں جس کے اثرات پوری

عمر آنے والی نسلوں پر پڑتے ہیں، اسی لیے اگر کسی کی ماں کے بارے میں دیکھنا ہو تو اس کی اولاد سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تربیت کرنے والی ہستی کیسی ہے، اسی لیے جن کی ماں رسولؐ اللہ کی بیٹی ہو، حضرت کی زوجہ ہو اور وہ خود صدق و صفا کا اعلیٰ ترین کردار ہو تو اس کی اولاد امام حسن اور امام حسین جیسی عظیم ہستیاں ہی ہوں گی، اس شعر کا یہی مفہوم ہے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اُسوۂ کامل بتول

☆☆☆☆

بس اطاعت کا نمونہ سیدہ بنت رسول
آپ کی سیرت ہے ماؤں کیلئے روشن اصول

اپنے بزرگوں کا ادب و احترام کرنا کسی بھی انسان کی اعلیٰ تربیت کا مظہر ہوتا ہے کیونکہ ہر شخصیت کی اخلاقی اور علمی نشو و نما ان ہی کے زیر سایہ ہوتی ہے، وہی ماحول اور تہذیبی اقدار قائم کرتے ہیں، اسی لیے جس قسم کے ماحول میں انسان تربیت پاتا ہے ویسی ہی اس کی شخصیت بنتی ہے۔ یہ جتنا اعلیٰ ہوگا ویسے ہی اس میں پلنے والے ہوں گے، اسی لیے جس ہستی نے رسولؐ اللہ کے زیر سایہ تربیت پائی اس کا مقام کس قدر بلند ہوگا۔ اس کا عملی نمونہ حضرت فاطمہ زہرا کی ذات گرامی ہی ہوسکتی ہے، اسی لیی اقبال کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی شخصیت رسولؐ اللہ کی ذات سے ادب و احترام کا پیکر ہیں اور دنیا بھر کی ماؤں کے لیے مثالی کردار ہیں۔

بہر محتاجِ دلش آں گونہ سوخت
با یہودے چادرِ خود را فروخت

☆☆☆☆

یہ سخاوت فاطمہ زہراؑ کے تھی کردار میں
بیچ دی محتاج کی خاطر رِدا بازار میں

کسی انسان کی زندگی میں جتنے بھی دنیاوی اعمال ہوتے ہیں ان سب سے افضل عمل دوسرے انسان کی ضرورت کے وقت اس کی حاجت کو پورا کرنا ہے، اس میں بھی درجات ہیں۔ امام علیؑ کے قول کے مطابق

سب سے اعلیٰ درجے کی نیکی وہ ہے جو انسان اپنی ضروریات کو کم کر کے یا ختم کر کے دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ یہی نفس کشی اور فقر کی علامت ہے۔ اہل بیت رسولؐ کی زندگی کے بے شمار واقعات اس عمل کی تاریخ کا حصہ ہیں، اسی قسم کے ایک واقعہ کا تذکرہ اقبال نے اس شعر میں کیا ہے جو حضرت فاطمہؓ سے منسوب ہے جس کے مطابق آپ نے ایک محتاج کی حاجت پوری کرنے کی خاطر اپنی رِدا کی بھی پروانہیں کی اور اس کو بازار میں فروخت کر دیا تا کہ اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔ یہ آپ کی سخاوت کی اعلیٰ مثال ہے۔

نوری و ہم آتشی فرماں برش
گم رضائش در رضائے شوہرش

☆☆☆☆

جس کے طابع تھے ملائک اور جنوں کی انجمن
اس نے دکھلایا ہے شوہر کی اطاعت کا چلن

نوری مخلوق یعنی فرشتوں اور آتشی مخلوق یعنی جنوں کے وجود کا اقرار ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ یہ امر بھی اس یقین کا حصہ ہے کہ یہ مخلوق اللہ کے برگزیدہ بندوں کے پاس اس دنیا میں آتی ہے تا کہ ان کی اطاعت کرے۔ حضرت جبرائیل کے وحی لانے کا یقین کیے بغیر ایمان مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے خیال میں فرشتوں کی آمد اور اطاعت کا اظہار صرف رسولؐ اللہ کی ذات تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کے اہل بیتؓ تک یہ سلسلہ قائم تھا اور ملائکہ اور جن ان کے در پر بھی اسی طرح حاضری دیتے تھے، اسی لیے وہ حضرت فاطمہؓ کی عظمت اور شوہر حضرت امام علیؑ سے ان کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس ہستی کے جن و ملائک تابع ہوں وہ اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے ہر اس عمل پر راضی ہو جاتی جس سے شوہر راضی ہوتے۔

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردہ و لب قرآن سرا

☆☆☆☆

آپ کا کردار تھا اک پیکر صبر و رضا
ہاتھ چکی پر رواں تھے اور لب قرآں سرا

خدا اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر ایمان ہونے کا سب سے بڑا پیمانہ انسان کا کردار و عمل ہے

جس کی بنیاد پر اسے پرکھا جا سکتا ہے۔ جتنا کسی کا ایمان قوی ہوگا وہ دنیاوی حرص و ہوس سے دور اور صابر اور اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوگا، اس کا یہ عمل بہ امر مجبوری نہیں ہوگا بلکہ یہ اختیاری فعل ہوگا، اسی لیے اس کا نہ گلہ کرے گا نہ کوئی شکایت۔ رسول اللہ کے اہل بیتؑ اس کردار و رویہ کے عملی اور مثالی نمونہ ہیں کیونکہ انہوں نے صبر و رضا کا دامن مشکل سے مشکل وقت میں بھی نہیں چھوڑا اور اس پر عمل کرتے رہے۔ حضرت فاطمہؓ کی ذات گرامی اس کی روشن مثال ہیں جن کے بارے میں قبال کہتے ہیں کہ آپ کی ذات صبر و رضا کا پیکر ہے اور اللہ سے قربت کی انتہا ہے کہ چکی پیسنے کے دوران بھی قرآن کی تلاوت جاری رہتی۔

گریہ ہائے اوزِ بالیں بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز

☆☆☆☆

بارگاہ رب میں وہ ہدیہ ترا
وہ عبادت تیری وہ گریہ ترا

جب خاص بندگانِ خدا اس کے حضور پیش ہونے کے مشتاق ہوتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے وقت اور موقع کا انتخاب کیا جائے جب کوئی بھی خدا اور ان کے درمیان مداخلت نہ کر پائے، بس وہ ہوں اور ان کا خدا ہو، قربت الٰہی کا احساس ہو جس سے وہ اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کر سکیں۔ عموماً یہ دن ختم ہونے کے بعد کا وقت ہوتا جب انسان اپنی تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر فرصت کے عالم میں ہوتا ہے اور خلق خدا اپنے اپنے ٹھکانوں میں ہوتی ہے، مکمل تنہائی اور خاموشی کے عالم میں عبادت میں مصروف بندگانِ خدا اسے دل کی گہرائیوں سے یاد کر رہے ہوتے ہیں۔ فرتِ جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے حضرت فاطمہؓ کی اسی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ وہ رات بھر عبادت میں مصروف رہتی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو موتی بن کر جاری رہتے تھے۔

اشک او برچید جبریل از زمیں
ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں

☆☆☆☆

ان مقدس آنسوؤں کو چن کے جبریل امیںؑ
مثل شبنم خود لٹا دیتے تھے باعرشِ بریں

عالم انسانیت میں اگر کوئی اخلاق و کردار اور تہجد گزاری کی اعلیٰ ترین مثال ہوسکتا ہے تو وہ رسولؐ اللہ کے اہلبیتؑ ہیں، ان کا ادا کیا ہوا ہر لفظ اور ہر عمل اللہ کی ہدایت کی عملی تفسیر ہوتا ہے، انہیں قرآن ناطق یا عملی قرآن کہا جاتا ہے، اسی لیے وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے کردار کا ایسا نمونہ ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر نہ صرف دنیا کو جنت نظیر بنا دیا جا سکتا ہے بلکہ اللہ کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اہلبیتِ رسول راتیں خدا کی عبادت میں گزارتے جس کے دوران عقیدت کے آنسو جاری رہتے، اسی کیفیت کو اقبال نے حضرت فاطمہؑ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ دوران عبادت ان کی آنکھوں سے رواں آنسو اس قدر مقدس تھے کہ اس سے قبل کہ وہ زمین پر آئیں حضرت جبریل انہیں چن لیتے تھے اور عرش پر موتیوں کی طرح بکھیر دیتے، اسی تقدس کی وجہ سے آپ کو جگر گوشہ رسول اور خاتون جنت کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰ ست

☆☆☆☆

حکم خالق کی ہمارے پاؤں میں زنجیر ہے
اور رسولؐ اللہ کے فرمان کی توقیر ہے

تاریخ میں کچھ ہستیاں ایسی ہیں جن کا احترام اور محبت سب ہی کرتے ہیں مگر ان کے چاہنے والے بعض اوقات اپنی عقیدت میں اس حد تک بڑھ جاتے ہیں جو خدا کی جانب سے مقرر کی گئی ہیں، اسی حوالے سے حضرت علیؑ کا قول ہے کہ میری وجہ سے دو قسم کے لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ اک وہ جو مجھ سے بغض رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو مجھ سے محبت میں خدا کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اقبال حضرت فاطمہؑ سے اسی حد تک عقیدت رکھتے تھے کہ اگر ایمان کی حدود مقرر نہ کردی جاتیں تو وہ کسی بھی مقام تک جا سکتے تھے، اسی مجبوری کا اظہار وہ اس شعر میں کر رہے ہیں کہ خدا کے حکم سے جو میرا واسطہ ہے وہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا ہے۔ دوسرے حضرت محمدؐ کا فرمان ہے جس کا مجھے پاس ہے ورنہ میں حضرت فاطمہؑ سے عقیدت میں تمام حدود پار کر لیتا۔

ورنہ گردِ تُربتش گردیدمے
سجدہ ہابر خاک او پاشیدمے

☆☆☆☆

ورنہ ہے ارماں طواف مرقد زہراؑ مجھے
اور ان کی خاک پر کرنا ہے اک سجدہ مجھے

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان ہونے کے لیے جس حقیقت کا اعتراف کرنا لازمی ہے وہ خدا کی وحدانیت ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی اللہ کے سوا، اسی لیے سجدہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور کسی مخلوق کے سامنے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح طواف بھی صرف خدا کے گھر یعنی خانہ کعبہ کے گرد ہی کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ کہیں بھی جائز نہیں لیکن اقبال حضرت فاطمہ زہراؑ سے عقیدت کی اس منزل پر تھے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر عقیدت کی پابندیاں نہ ہوتیں تو وہ مرقد زہراؑ کا طواف کرتے اور ان کی خاک پر سجدہ کر کے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے جو ان کے دل میں ہے مگر یہ ممکن نہیں کیونکہ نہ اللہ اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ فرمان رسول میں اس کی گنجائش ہے، اس لیے میں مجبور ہوں۔

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند

☆☆☆☆

تیرے جذبوں کی بلندی ہے عطائے لم یزل
فاطمہ زہرا کی سیرت دیکھ لے اور اس پر چل

تخلیق انسان کی ابتدا سے لے کر آج تک انسانوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ ایسے کام کریں جن کی بدولت نہ صرف ان کا نام روشن اور زندہ رہے اور آنے والے زمانے کے لوگ ان کو یاد رکھیں بلکہ عالم انسانیت کا بھی بھلا ہو۔ آنے والی نسلیں ان کے کارنامے یاد کر کے ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سے بھی بہتر کام کریں۔ ایسی ہی عظیم ہستیوں میں ایک فاطمہ زہرا ہیں جن کا شمار اقبال کے نظریہ کے مطابق عظیم ترین میں ہوتا ہے، اسی لیے وہ مخدرات اسلام سے مخاطب ہو کر

کہتے ہیں کہ اگر چہ قدرت نے تجھے انسانیت کی بھلائی کے لیے بلند جذبہ اور حوصلہ عطا کیا ہے تو اگر غور و فکر کے ساتھ حضرت فاطمہ زہرا کی ذات و کردار کا مطالعہ کرے تو یہ جذبہ مزید پختہ ہو جائے گا۔

تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بگلزار آورد

☆☆☆☆

تا کہ تیری شاخ پر مثلِ حسین اک گل کھلے
موسمِ انسانیت کو روحِ تازہ پھر ملے

دنیا کے ہر معاشرے میں آئندہ آنے والی نسلوں کی نشوونما ان کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار کا دارومدار بڑی حد تک ماں کی شخصیت پر ہوتا ہے۔ یہی وہ ہستی ہوتی ہے جس کے زیر سایہ مستقبل کی نسلیں پروان چڑھتی ہیں، اسی کردار کی پرتو ہوتی ہیں جو ماں کا عمل ہوگا، اسی کا عکس ہر فرد میں نظر آئے گا۔ ضروری ہے کہ تاریخ کی ماؤں کے کردار و عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے تربیت کی جائے، اسی لیے اقبال نے اسلامی تاریخ کی نہیں بلکہ تاریخ انسانیت کی سب سے اعلیٰ مثال ماں کو اپنا نمونہ بنانے کو کہا ہے، ان کے مطابق حضرت فاطمہ کے کردار کا مطالعہ کرنے اور اس پر عمل کرنے سے امام حسن اور امام حسین کے کردار دنیا کے سامنے آئیں گے جو دنیا کو گلزار بنا دیتے ہیں اور انسانیت کا نام روشن کرتے ہیں۔

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نہ میری

☆☆☆☆

اگر تو مجھ گدا کی بات سن لے
تو لمبی زندگی کی راہ چن لے

عام طور پر اس دنیا میں جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے اس کا عرصہ حیات چند باتوں سے زیادہ نہیں ہوتا جس کے بعد اسے دنیا سے رخصت ہونا ہوتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے مگر انہی انسانوں کے ہجوم میں کچھ مختصر تعداد میں ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جن کی مادّی و جسمانی مدت حیات تو پوری ہو جاتی ہے مگر ان کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے جو رہتی دنیا تک کے لیے مثال بن جاتے

ہیں۔اس شعر کا مفہوم یہی ہے جس میں اقبال ملت مسلمہ سے عموماً اور دختران ملت سے خصوصاً مخاطب ہیں کہ اگر اس درویش وفقیر کی بات سن لو اور اس پر عمل کرو تو تمہیں حیات جاوداں نصیب ہوگی۔

بتولے باش و پنہاں شوازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

☆☆☆☆

رہے خانہ نشیں زہرا کی طرح
ترا بچہ حسینی فکر و گن لے

اقبال صرف ایک بلند شاعر ہی نہیں بلکہ اسلامی فلسفہ حیات کے اعلیٰ مفکر بھی ہیں، اسی لیے وہ مسلمانوں کی تاریخ کے ان کرداروں کا تذکرہ اپنے اشعار میں تسلسل سے کرتے ہیں جن کے نقش قدم پر عمل کر کے مسلمان پستی و پسماندگی سے نکل کر عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ مردوں کو ہی نہیں خواتین کو بھی ترقی کے اس عمل کا حصہ قرار دیتے ہیں، اسی لیے خواتین میں جس ہستی کا عقیدت کی حد تک احترام کرتے ہیں وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی ذات گرامی ہے جن کو وہ تمام خواتین کے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر آج کی خواتین حضرت فاطمہ زہرا کی طرح اپنی اولاد کی رہنمائی اور تعلیم و تربیت کریں تو وہ شبیر یعنی امام حسین کی راہ پر عمل کرنے والوں کی ماں کہلائیں گی۔

مدح امام حسینؑ

ہر کہ پیماں با ہوالموجود بست
گردنش او بندِ ہر معبود رست

☆☆☆☆

عہد و پیماں جس نے باندھا حق کے ساتھ
اس نے توڑا رشتہ ہر ناحق کے ساتھ

ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد اس حقیقت کے اقرار اور یقین پر ہے کہ اس کائنات میں جس کی حدود کا تعین انسان کے احاطہ ادراک کی حدود میں نہیں، اس کا خالق کوئی نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے کوئی دوسری ہستی نہیں ہے لیکن یہ اقرار صرف زبانی طور پر ہی کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ جب تک دل کی گہرائیوں سے اس پر یقین نہ کر لیا جائے اس وقت تک اس کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور جب کوئی انسان اس منزل کو پہنچ جاتا ہے جہاں کسی غیر اللہ کی کوئی اہمیت نہیں رہتی تو وہ کسی بھی حالت میں اپنا رشتہ یا تعلق کسی دوسری ہستی سے قائم نہیں رکھتا۔ یہی خیال اس شعر کا بھی ہے کہ جب کوئی حق کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ہر ناحق سے اپنا تعلق ختم کر لیتا ہے۔

مومن از عشق است و عشق سات و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ممکن است

☆☆☆☆

عشق ہی انسان کو مومن کرے
اور یہ ناممکن کو بھی ممکن کرے

اقبال کے فلسفے کی بنیاد جن عناصر پر قائم ہے ان میں جذبہ عشق بنیادی اہمیت رکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ہستی سے اس طرح تعلق قائم کر لینا کہ انسان اپنے ہر عمل کے لیے اسی کا طابع ہو جاتا ہے اور کوئی قدم اس کی مرضی اور بتائے ہوئے راستے کے برخلاف نہیں اٹھا سکتا۔ خاص طور پر جب یہ تعلق اور عشق خالق حقیقی سے ہو تو وہ انسان مومن کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے جو انسان کو اس قابل کر دیتا ہے کہ وہ ناممکنات کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔ اس خیال کو اقبال نے اس شعر کا مرکزی خیال بنایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس طرح عشق انسان کو مومن بنا دیتا ہے اسی طرح مومن بھی عشق کی عملی صورت ہے جس کے

بعد مومن ہر ناممکن کو ممکن بنا دینے کی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔

عقل سفاک است و او سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

☆☆☆☆

عقل ہے سفاک اور یہ عشق ہے سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

فلسفہ اقبالؔ میں عقل اور عشق میں ایک کشمکش کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جس کا اظہار وہ اپنے کلام میں متعدد مقامات پر کرتے رہے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں عقل معرکہ حق و باطل میں دلائل اور اس کے انجام پر غور کرتی رہتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کرتی ہے جبکہ عشق اگر حقیقی ہو تو وہ انجام کے نتائج سے بے پروا ہو کر بے خطر آتش نمرود میں کود جاتا ہے اور عقل حیران و پریشان دیکھتی رہ جاتی ہے، اسی جذبہ عشق کی کیفیت کو اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ہر چند کہ عقل سفاک و چالاک ہے اور ہر فیصلہ دلیل کے مطابق کرتی ہے مگر عشق اس سے بھی زیادہ برتر ہے کیونکہ اس کا جذبہ پاک ہے، اسی لیے وہ زیادہ چالاک اور سفاک ہے جس کی وجہ سے اسے کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل

☆☆☆☆

عقل جب تک ڈھونڈتی رہتی ہے اسباب و علل
عشق کر لیتا ہے تب تک سر یہ میدانِ عمل

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب حق و باطل مد مقابل ہوں تو ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جہاں سوائے باطل کا مقابلہ کرنے کے کوئی دوسرا راستہ ممکن نہیں رہتا، ایسے میں جذبہ عشق ہی ہوتا ہے جو انسان کو وہ طاقت و ہمت دیتا ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر مقابل کھڑا ہو جائے اور عقل پس پردہ ہو جاتی ہی کیونکہ عقل کو جب یہ مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ اس اسباب و عوامل اور نتائج پر نظر رکھتے ہوئے اپنا لائحہ عمل طے کرتی ہے جبکہ جذبہ عشق صرف اپنے مقصد کے حصول کا متمنی ہوتا

ہے، چاہے اس کے لیے اسے اپنی جان بھی دینی پڑے جو اس کی دائمی فتح کی علامت بن جاتا ہے، اسی لیے اقبال کا خیال ہے کہ جتنے وقت میں عقل فیصلہ کرنے میں صرف کرتی ہے عشق کامیابی کی منزل سے گزر جاتا ہے۔

عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند

☆☆☆☆

عشق اپنے زور بازو سے کرے ہر دم شکار
عقل ہے مکار دیتی ہے یہ عیاری کی مار

زندگی کے مقاصد کے حصول کے لیے انسان دو ہی طریقے اختیار کرتا ہے ایک وہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتا ہے جس کی پشت پر اپنے مقصد کی صداقت پر یقین محکم ہوتا ہے جو اس کے لیے طاقت اور ہمت کا باعث بنتا ہے، اسی جذبہ کو اقبال عشق کا نام دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ عقل کے بارے میں کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعے بھی کامیابی کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے اور اس میں مقصد حاصل بھی ہو جاتا ہے کیونکہ عقل مکاری اور عیاری کے طور طریقے اختیار کر کے یہ حاصل کرتی ہے جو ایک نامناسب طریقہ ہے، اس لیے باطل پر برتری حاصل کرنے کے لیے بجائے یہ کہ مکاری و عیاری کا راستہ تلاش کیا جائے بہتر ہے اپنے زور بازو اور جذبہ عشق پر بھروسہ ہو، یہی حق ہے۔

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

☆☆☆☆

عقل پیدا کرتی ہے شک و شبہ انسان میں
عشق ہے عزم یقیں اور پختگی ایمان میں

عشق اور عقل کی کشمکش اقبال کی شاعری کے نمایاں پہلو ہیں، وہ عقل کے مقابلے میں عشق کی برتری کے قائل ہیں اور اپنے موقف کو مختلف دلائل سے درست قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال

میں عقل وقت آنے پر اپنے عمل کے لیے مختلف دلائل کا سہارا لیتی ہے جس کی وجہ سے شک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے کامیابی کے لیے جس عزم و ہمت اور یقین کامل کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہوتی ہے جبکہ جذبہ عشق یقین کی اس کیفیت کا عکاس ہوتا ہے جہاں کوئی خطرہ اور طاقت اس کے جذبہ ایمانی کے مقابل نہیں آسکتی اور وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ اس شعر کا یہی خیال ہے کہ عقل انسان میں شک و شبہات پیدا کرتی ہے جبکہ عشق سے ایمان میں عزم و یقین پیدا ہوتا ہے۔

آں کند تعمیر تا ویراں کند
ایں کند ویراں کہ آباداں کند

☆☆☆☆

عقل کی تعمیر میں تخریب ہوتی ہے نہاں
عشق کی ویرانیوں سے بھی ہیں تعمیریں عیاں

عقل اور جذبہ عشق کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کا خیال ہے، عقل کے تحت جو کام کیے جاتے ہیں وہ بظاہر تعمیراتی ہوتے ہیں مگر ان میں پنہاں تخریبی عنصر نظر نہیں آتا جو آخرکار ویرانی کا باعث ہوتا ہے۔ آج کل کے حالات جو ہمارے اطراف واقع پذیر ہو رہے ہیں وہ ان خیالات کی ترجمانی کے لیے کافی ہیں۔ اس کے برعکس عشق کا جذبہ کیونکہ بے غرض ہوتا اور اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا اس لیے اس کا ہر اقدام ترقی اور اعلیٰ انسانی اقدار کا ذریعہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ویرانوں میں رونق ہو جاتی ہے اور تعمیر کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے، اسی لیے عشق کو عقل پر برتری حاصل ہے۔

عقل چوں باداست ارزاں درجہاں
عشق کمیاب و بہائے او گراں

☆☆☆☆

عقل مانند ہوا دستیاب ہے
عشق نادر بھی اور کمیاب ہے

اگر ہم اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں تو اندازہ لگانا کوئی دشوار نہیں ہوگا کہ ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک عقل پائی جاتی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ انسان کے علاوہ ہر ذی روح کو قدرت نے اس کی ضرورت کے مطابق عقل سے نوازا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کے معمولات کو ترتیب دیتا ہے، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ عقل اسی طرح عام اور ارزاں ہے جس طرح سے اس دنیا میں ہوا جو ہر ایک کو میسر ہے لیکن عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر کسی میں نہیں پیدا ہوتا، اس کو حاصل کرنے کے لیے بڑے ریاض اور حصول علم کی ضرورت ہے جس کے بغیر نہ کوئی فرد یقین کی منزل تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی محبت کو عقیدت کی اس منزل تک پہنچا سکتا ہے جسے عشق حقیقی کہتے ہیں جس کے بعد انسان اپنی ذات سے بلند تر ہو کر صرف حق وصداقت کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

عقل محکم از اساسِ چون و چند
عشق عریاں از لباسِ چون و چند

☆☆☆☆

مصلحت ہے عقل کی یکسر اساس
عشق کو اس سے غرض ہے اور نہ پاس

یہ عام زندگی کا تجربہ ہے کہ جب حق و باطل کی درمیان کوئی معرکہ درپیش ہو تو دو قسم کے رویے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے جس میں اپنے عمل کے مختلف پہلو پر غور کیا جاتا ہے، اس کے منفی اور مثبت نتائج پر غور کیا جاتا ہے اور اگر کامیابی کے امکانات نمایاں ہوتے ہیں تو اپنے موقف کی برتری کے لیے قدم اٹھایا جاتا ہے اور اگر نتائج اس کے برعکس ہونے کا امکان ہوتا ہے تو پسپائی اختیار کرلی جاتی ہے لیکن اس کے مقابل عشق کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ نتائج کی پروا سے بے خبر باطل کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے اور ہر مشکل وقت میں استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے کیونکہ اسے اپنی حقانیت پر مکمل یقین ہوتا ہے، اسی لیے وہ آزمائش میں ہی خوشی محسوس کرتا ہے۔ اقبال نے اسی صورتحال کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

عقل می گوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحانِ خویش کن

☆☆☆☆

عقل خود اپنی نمائش میں ہے خوش
عشق لیکن آزمائش میں ہے خوش

اقبالؔ کی شاعری میں جذبہ عشق سے وہ ایمانی منزل مراد ہے جہاں پہنچ کر انسان محبت ومودت کے اس درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جہاں اس کی ذات بے معنی ہو جاتی ہے اور زندگی کا ہر قدم صرف اللہ کی ذات کے لیے ہی اٹھتا ہے، اسے نہ نتائج کی پروا ہوتی ہے نہ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی کوئی نمود ونمائش ہو، سوائے اس کے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور باطل بے نقاب ہو۔ اس کے عمل میں عقل کے مقابلے میں عقیدت اور یقین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے کیونکہ عقل والے نہ صرف یہ کہ نتائج پر نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا مقصد نمود ونمائش بھی ہوتا ہے، اسی لیے وہ یقین کے اس مقام تک نہیں پہنچ پاتے جہاں انسان بے خوف وخطر باطل کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے تاکہ حق کی نہ صرف حفاظت کر سکے بلکہ رہتی دنیا تک ایک مثال قائم کر جائے۔

عقل باغیر آشنا از انتساب
عشق از فعل است باخود در حساب

☆☆☆☆

عقل مستحکم ہوا کرتی ہے کسب علم سے
عشق بڑھتا ہے خدا کے فضل سے اور حکم سے

خدا نے انسان کو جو خواص عطا کیے ہیں ان میں ایک عقل بھی ہے جو اگر وہ چاہے تو اس میں اضافہ ہو سکتا ہے جس کا ذریعہ علم ہے۔ جوں جوں دائرہ علم وسیع ہوتا جائے گا عقل کا فروغ جاری رہے گا۔ گویا اس کا دارومدار انسان کی اپنی صلاحیت اور کاوشوں پر منحصر ہے کہ وہ کتنا علم حاصل کرتا ہے جبکہ اقبالؔ کے خیال میں عشق کا جذبہ خدا کے فضل وکرم سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان ریاض اور ذکر اللہ سے اسے اس منزل تک پہنچاتا ہے جو اس جذبہ کا اصل مقصود ہے کیونکہ اس ریاض کی بنیاد

خوداحتسابی ہے جس میں انسان اپنا احتساب خود کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اسے اپنی کمزوریوں کا احساس پیدا ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے عمل سے درست کرتا رہتا ہے جو اس کی کامیابی کا راز ہے۔

عقل گوید شاد شو، آباد شو
عشق گوید بندہ شو، آزاد شو

☆☆☆☆

عقل کہتی ہے کہ تو بس شاد ہو آباد ہو
عشق بس خالق سے کر اور غیر سے آزاد ہو

اقبالؔ کی شاعری میں عشق اور عقل کا موازنہ تسلسل سے کیا گیا ہے، ان کے یہاں عشق سے مراد حقیقی عشق ہے۔ یعنی خدا سے عشق ان کے خیال مین عقل صرف دنیا کے مادی مسائل کا حل تلاش کرتی ہے جس کا مقصد صرف مادی اور وقتی منفعت حاصل کرنا ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ نہ صرف ختم ہوجاتا ہے بلکہ انسانی اقدار کی سربلندی کے حوالے سے اس کی کوئی افادیت نہیں ہوتی جبکہ عشق کیونکہ خدا کی ذات سے کیا جاتا ہے اس لیے انسان اس کی ہدایت کے مطابق اپنا عمل بہتر سے بہتر کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ خدا کا حقیقی معنی میں ایک آزاد انسان ہوجاتا ہے۔

عشق را آرامِ جاں حریت است
ناقہ اش را سارباں حریت است

☆☆☆☆

عشق کی نظروں میں آزادی کی ہے اہمیت
اس کے ناقے کے لیے بس سارباں ہے حریت

حقیقی عشق کیونکہ صرف خدا کی ذات سے کیا جاتا ہے، اسی لیے اس کے آگے کیا جانے والا ایک سجدہ انسان کو ہر سجدے سے آزاد کردیتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اسے اپنے موقف سے دستبردار نہیں کرسکتی، اس کا یہی کردار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنے والی نسل کی رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے اس شعر میں بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ عشق کیونکہ تمام دنیاوی پابندیوں

سے آزاد ہوتا ہے اس لیے اسے اسی آزادی حریت میں آرام وسکون حاصل ہوتا ہے کہ اگر عشق اس کی سواری ہے تو آزادی اس کا سوار ہے جو اپنی منزل حق وصداقت کی جانب رواں ہے۔

آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق باعقلِ ہوس پرور چہ کرد

☆☆☆☆

کیا سنی ہے تو نے یہ عقلِ ہوس کی داستاں
لے چکی ہے جنگ میں عشق جواں کا امتحاں

اقبالؔ عقل کا تذکرہ اوراس کی خصوصیات وکردار کا تذکرہ اور حقیقی عشق سے تقابل کرنے کے بعد تاریخ انسانیت سے اس کی مثال بیان کرتے ہیں جس کے لیے انہوں نے واقعہ کربلا کا انتخاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ عقل نے کیسا ماحول بنایا جس میں دنیاوی حرص و ہوس عروج پر تھی۔ اخلاقی پستی کا عروج تھا اور اللہ کے بنائے ہوئے اصول پامال کیے جا رہے تھے، ایسے میں عشق ہی تھا جو اس کے مدمقابل آیا اور کسی مادی منفعت کی پروا نہیں کی اور بے خطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے حق وصداقت کا علم ہمیشہ کے لیے سربلند کر دیا اور عقل والوں کی بداعمالیوں کا پردہ چاک کر کے عشق کو رہتی دنیا کے لیے سرفراز کر دیا۔

آں امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادے زِبستان رسول

☆☆☆☆

وہ خدا کے عاشقوں کا اک امام و رہنما
باغ زہرہ و نبی کا ایک سرو خوش نما

عشق حقیقی کی فضیلت بیان کرنے کے بعد اقبالؔ ایک ایسے بلند کردار ہستی کو تلاش کرتے ہیں جو جذبہ عشق کی حقیقتاً مثال ہو۔ تاریخ کے اوراق سے ہو جس شخصیت کا انتخاب کرتے ہیں وہ امام حسینؑ کی ہے۔ ان کے خیال میں کربلا میں شہید ہونے والے خدا کے عاشقوں میں ہیں جن کی مثال نہیں ملتی، اسی

لیے امام حسینؑ کی ذات ان ہستیوں کی امام ہے جو جذبہ عشق سے سرشار ہین اور نتائج سے بے پروا باطل کے سامنے اعلان حق کرتے ہوئے اپنی جاں نثار کردیتے ہیں۔اس شعر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ زہرہ کے بیٹے یعنی امام حسینؑ عاشقوں کے سردار ہین جو حضرت محمدؐ کے لگائے ہوئے باغ میں ایسے ہی ہیں جیسے کسی باغ کا خوبصورت ترین درخت سرو کا ہوتا ہے۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

☆☆☆☆

ان کی عظمت ہے کہ باباہائے بسم اللہ ہیں
جبکہ وہ خود فدیہ اسماعیل ذبح اللہ ہیں

اقبالؔ نے اس شعر میں دو روایتوں کو یکجا کیا ہے،ایک وہ حضرت علیؑ کی شان بیان کرتے ہوئے آپؑ کے قول کا تذکرہ کررہے ہیں جس میں آپؑ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ جو کچھ قرآن میں ہے اس کا اختصار سورہ الحمد میں اور جو اس میں ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہے۔اس کو بھی سمویا جائے تو ''ب'' میں اور اس کو بھی سمیٹ دیا جائے تو بے کے نکتہ میں ہے اور وہ نکتہ میں ہوں۔یعنی میری پوری زندگی قرآں کی ترجمانی کرتی ہے، اسی لیے ''ب'' کو قرآن ناطق کہا گیا ہے۔دوسرے مصرعے میں وہ روایت بیان کی ہے جس کے مطابق حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کو مستقبل میں ہونے والی ذبح عظیم کے لیے ملتوی کردیا گیا تھا جس کی تکمیل واقعہ کربلا میں ہوئی۔یہ شعر اقبال کی رسولؐ اللہ اوران کے اہل بیتؑ سے عقیدت کا کھلا اور مکمل اظہار ہے۔

بہرآں شہزادۂ خیر الملل
دوش ختم المرسلین نعم الجمل

☆☆☆☆

بہترین امت کا جو سردار تھا
دوش احمد کا وہی حقدار تھا

اقبالؔ نے اپنی شاعری میں رسولؐ اور آل رسولؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار نہ صرف جا بجا کیا ہے بلکہ اس میں ابتدا سے آخر تک ایک تسلسل پایا جاتا ہے جو ان کی عقیدت کے اظہار کا ثبوت ہے۔اس

شعر میں امام حسینؓ کی فضیلت اور رسولؐ اللہ کا ان سے تعلق بیان کر رہے ہیں کہ رسولؐ اللہ اپنے نواسے کو کیا مقام دیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ خانوادہ رسولؐ کے شہزادے ہونے کے ناطے امت کے سردار ہیں اور کیونکہ رسولؐ اللہ اکثر و بیشتر امام حسینؓ سے اظہار محبت کے طور پر ان کا ناقہ بن کر اپنے دوش پر سوار کرلیا کرتے تھے جس کے حوالے سے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس فضیلت کا حق دار صرف نواسۂ رسولؐ ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ان جیسا دوسرا نہ کوئی ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

سرخ رو عشق غیور از خونِ او
شوخیٔ این مصرع از مضمونِ او

☆☆☆☆

سرخ رو ہے عشق اس کے خوں سے
شعر کی شوخی ہے اس مضمون سے

حقیقت میں عشق ایسا جذبہ ہے جو صرف اعلیٰ کردار اور بازرف شخصیتوں کو ہی نصیب ہوتا ہے جس کے بعد خدا کی ذات درحقیقت ان کی شہہ رگ سے قریب ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی ہر شہ ان کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس کردار کی اعلیٰ ترین مثالیں رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ ہی ہو سکتے ہیں جن میں امام حسینؓ کی ذات بھی شامل ہے، اسی لیے اقبال کہتے ہیں کہ کربلا میں امام حسینؓ اور ان کے رفقاء نے رضائے الٰہی کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے جذبہ عشق کو ہمیشہ کے لیے سرخ رو کر دیا جس کا ذکر آنے والی نسلیں شعر کی صورت میں بیان کرتی رہیں گی جو امت کے لیے رہنمائی کا باعث ہے۔

درمیانِ امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قل ہواللہ در کتاب

☆☆☆☆

اس طرح نام ان کا آئے ملت بیضا کے بیچ
جس طرح حرف قل ہواللہ ہے کتاب اللہ کے بیچ

اسلام میں ایمان کی بنیادی شرط اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے، اسی لیے یہ بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ

ہم اپنی اس یقین کی تجدید کرتے رہیں، اسی لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو سب سے پہلے دیگر از اللہ کا انکار کرتا ہے پھر اللہ کے واحد اور لاشریک ہونے کا اقرار کرتا ہے، اسی لیے ہر عبادت میں قل ہواللہ پڑھا جاتا ہے اور قرآن میں اس کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس شعر میں علامہ اقبالؔ امام حسینؑ کی امت کی اہمیت اور اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے خیال میں جو مقام کلمہ قل ہواللہ کو قرآن میں حاصل ہے وہی حیثیت امام حسینؑ کو امت محمدیؐ میں حاصل ہے کہ ان پر ایمان لائے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

☆☆☆☆

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
حق و باطل کی دو قوت ہیں قدیمی اور جدید

ہماری کائنات جب سے وجود میں آئی ہے اور انسان نے دنیا میں جنم لیا ہے اسی روز اول سے اس کے درمیان حق و باطل کا مقابلہ بھی جاری ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ ایک جانب وہ قوتیں ہوتی ہیں جو معاشرے میں فسق و فساد اور جہل و تاریکی کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کے مقابل وہ ہوتی ہیں جو امن و آشتی اور علم و روشنی کی علمبردار ہوتی ہیں۔ یوں تو ہر زمانے میں یہ کشمکش جاری رہتی ہے لیکن تاریخ میں بعض ہستیاں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو اس جدوجہد کی نمائندہ بن کر ہمارے لیے عملی کردار کا مثالی نمونہ بن جاتی ہیں۔ اقبالؔ اسی تاریخی حقیقت کا اس شعر میں بیان کرتے ہوئے حضرت موسیٰؑ اور فرعون اور امام حسینؑ و یزید کے کردار کا تذکرہ کر رہے ہیں جو حق و باطل کے معرکہ کی مثال ہیں۔

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

☆☆☆☆

زندہ ہے حق آج بھی بس قوت شبیر سے
مٹ گیا باطل مگر ظالم تری تدبیر سے

تاریخ عالم میں کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جو حق وصداقت اور اس کے لیے جدوجہد اور قربانی کی مثال بن جاتے ہیں۔ یہی وہ مثالی کردار ہوتے ہیں جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آئندہ آنے والی نسلیں معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کو قائم کرنے کی کاوشوں میں نہ صرف رہنمائی حاصل کرتی ہیں بلکہ ان کے کردار سے ان کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کرتی ہیں۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اقبال امام حسینؓ کے کردار کو مثال قرار دیتے ہیں کہ آج جو حق پرستی زندہ ہے اس کی وجہ کربلا میں امام حسینؓ کا کردار اور قربانی جس سے حق کو نہ صرف طاقت ملتی ہے بلکہ باطل کی یہ حسرت کہ وہ غالب آ جائے اپنی موت خود ہی مٹ جاتا ہے۔

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت
حریت را زہر اندر کام ریخت

☆☆☆☆

جب خلافت پھر گئی اللہ کے فرمان سے
اور دشمن ہوگئی وہ حریت کی جان سے

تاریخ اسلام کا اگر سرسری جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ بعد از وفات رسولؐ خدا چند سالوں میں ہی اسلام کے قائم کردہ معاشرتی اور سیاسی اصولوں کو ترک کر کے خلافت کی روح کو تبدیل کردیا گیا اور موروثی اقتدار قائم کردیا گیا جس کی وجہ سے قرآن سے رشتہ کمزور ہوگیا، اس لیے مسلمانوں میں جو حریت فکر فروغ پا رہی تھی اس کا تسلسل رک گیا جو امت کے لیے زہر قاتل ثابت ہوا اور اس کا فکری تنزل شروع ہوگیا۔ اس شعر میں اقبالؔ اسی تاریخی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے خیال کرتے ہیں کہ

ملوکیت کا قیام در اصل اللہ کے قائم کردہ اصولوں سے انحراف اور امت کے لیے زہر کا اثر رکھتا ہے۔

خاست آں سرجلوہ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

☆☆☆☆

تب حسین ابن علیؑ وہ معجزہ دکھلا گئے
ابر رحمت کی طرح ساری فضا پر چھا گئے

اقبالؔ اس شعر میں تاریخ اسلام کے اس فیصلہ کن موڑ کو بیان کر رہے ہیں جب اللہ اور رسولؐ کے بتائے اور قائم کیے ہوئے نظام کو ختم کر کے وہ نظام رائج کرنے کی کوشش کی جارہی تھی جو اسلامی تعلیمات کے برعکس تھا۔یعنی خلافت کا خاتمہ کر کے موروثی بادشاہت قائم کرنے کی کوشش ہو رہی تھی اور ایسے میں صرف ایک امام حسینؓ کی ہستی تھی جس نے نہ صرف اس کے خلاف آواز بلند کی بلکہ عملی قدم بھی اٹھایا جس کے نتیجے میں انہوں نے اور ان کے احباب نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں، یہ عمل کسی معجزے سے کم نہ تھا۔اسی طرح آپؑ کی ذات امت کے لیے کسی ابر رحمت سے کم نہیں جس سے اس کی عزت و وقار قائم ہے۔

برزمیں کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

☆☆☆☆

کربلا کی سرزمیں کو سرخ رو یوں کردیا
ایک ویرانے کو اس نے لالہ رو یوں کردیا

تاریخ میں حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کے واقعات کا تزکرہ ہمیشہ سے ملتا ہے۔ان کی زمین پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش اور کوشش بھی انسانی تاریخ کا حصہ ہے لیکن جو اثرات واقع کربلا نے اسلامی تاریخ پر مرتب کیے اس کی مثال کہیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔آج سیکڑوں برس گزر جانے کے باوجود اس کا اثر کم نہیں ہوتا کیونکہ اس واقع کی نشانیاں عملاً بھی موجود ہیں، اسی لیے اقبالؔ نے کہا کہ امام

حسینؑ نے اپنی اور اپنے احباب کی جانوں کی قربانی دے کر کربلا کی سرزمین کو اپنے خوں سے اس طرح سرخ کر دیا جس طرح کسی ویرانے میں لالہ کے سرخ پھول کھلتے ہیں۔

تاقیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

☆☆☆☆

تاقیامت ظلم کو برباد اس نے کردیا
اپنے خوں سے اک چمن آباد اس نے کردیا

کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے عیال و احباب کی قربانی کا مقصد ظلم و استبداد کو مٹانا اور عدل و انصاف کا قیام تھا جو اسلامی تعلیمات کی اصل روح ہے، اسی لیے صدیوں کا وقت گزر جانے کے باوجود آج بھی جہاں حق و صداقت کی معرکہ آرائی ہوتی ہے یا مصائب کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں کربلا کو ایک استعارے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، یہی اس قربانی کی عظمت کی دلیل ہے جو تاقیامت قائم ودائم رہے گی۔اسی لیے اقبالؔ نے کہا کہ اس واقعے نے ظالم ہی نہیں ظلم کو بھی قیامت تک کے لیے برباد کردیا اور اپنی قربانی سے حق و صداقت کا ایک ایسا چمن آباد کردیا جو ہمیشہ ایک مثال بن کے ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الہ گردیدہ است

☆☆☆☆

جس کا خوں اللہ کی خاطر بہا
ہے وہی بیشک بنائے لا الہ

کسی بھی فرد کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی اولین شرط اس امر کا اقرار ہے کہ وہ اللہ کے وجود اور اس کی وحدہٗ لاشریک ہونے کا صدق دل سے اقرار کرے، صرف اس کے آگے سجدہ ریز ہو، حق و صداقت کے لیے کسی دنیاوی قوت سے مرعوب نہ ہو لیکن ایمان کی یہ منزل اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کسی بھی غیر اللہ کی قوت سے انکار نہ کیا جائے۔ چاہے کیسے ہی مشکل

حالات کیوں نہ ہوں، اسی لیے اقبالؔ نے انسانی کردار کی عظمت کو کلمہ لا الہ سے منسلک کر دیا ہے۔ اس شعر میں بھی وہ امام حسینؓ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی جان قربان کر دی مگر جابر کی حاکمیت کو قبول نہیں کیا اور لا الہ کی بنیاد کردار کا مثالی نمونہ بن گئے۔

مدعا یش سلطنت بودے اگر
خود نکردے با چنیں ساماں سفر
☆☆☆☆
حکمرانی ہوتا گر مقصد تو وہ
بے سرو ساماں سفر کرتے نہ وہ

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی فرد یا گروہ حاکم وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے تو اس کا مقصد دنیاوی اقتدار اور جاہ و حشم حاصل کرنا ہے تا کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کر سکے لیکن اسلام کا نظام حکومت اس کے برخلاف ہے، جہاں حاکم کو معاشرے کے سب سے کم حیثیت فرد کے معیار کے مطابق زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ امام حسینؓ کے انتہائی اقدام کی وجہ بھی یہی تھی کہ حاکم وقت اس نظام کے برخلاف اقدامات کر رہا تھا، نہ کہ اپنے لیے اقتدار حاصل کرنا تھا۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے اس شعر میں بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کا مقصد حکومت حاصل کرنا ہوتو وہ کسی لشکر کو ساتھ لے جانے کے بجائے اپنے عیال کو کہیں لے جاتے۔

سرِ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود
یعنی آں اجمال را تفصیل بود
☆☆☆☆
راز اگر اک ذکر ابراہیمؑ وف اسماعیلؑ تھا
کربلا کا واقعہ بس اس کی ہی تفصیل تھا

قرآن کے مطابق جب خدا کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ اپنی سب سے عزیز ترین شے میری راہ میں قربان کرو تو آپ حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے لے گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ آپ

کو ذبح کرتے قدرت کی جانب سے ان کی جگہ دنبہ آ گیا اور حضرت اسماعیلؑ بچ گئے لیکن اس قربانی کو ذبح عظیم کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اقبالؔ اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کر رہے ہیں کہ اگر حضرت ابراہیمؑ کا خواب اور حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا ملتوی ہونا اگر ایک راز تھا جس کو آئندہ تاریخ میں حقیقت بننا تھا تو کربلا میں امام حسینؑ اور ان کے عیال و احباب کی قربانی اس کی تکمیل تھی، اسی لیے اسے عظیم قربانی کا درجہ حاصل ہے۔ اقبالؔ نے اسی خیال کو اپنے دیگر اشعار میں بھی بیان کیا ہے۔

عزم او چوں کوہساراں استوار
پائیدار و تند سیر و کامگار

☆☆☆☆

کربلا میں دیکھیے عزمِ حسینؑ کا وقار
سر کٹا کر بھی رہا جو تا قیامت کامگار

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ دائمی فتح و شکست کا فاصلہ کوئی فوری واقع پذیر ہونے والا واقعہ نہیں ہوتا بلکہ گزرنے والا وقت یہ طے کرتا ہے کہ فاتح کون ہے اور شکست کس کو ہوئی، جو ہستیاں حق و صداقت کے لیے قربانی دیتی ہیں وہ بظاہر دنیاوی طور پر زیر ہوتی معلوم ہوتی ہیں اور باطل کامیاب نظر آتا ہے مگر تاریخ کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا ہے جس کی سب سے روشن مثال کربلا میں امام حسینؑ کا واقعہ ہے جس کی وجہ سے وہ حق کی مثال اور باطل قوتیں ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گئیں۔ اس شعر میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ آپ کا عزم و استقلال پہاڑوں کی طرح بلند اور مستحکم تھا، اسی وجہ سے آپ کی ذات قیامت تک کے لیے کامیابی اور کامگاری کی علامت بن گئی۔

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد
دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

☆☆☆☆

اس کے دشمن ریگِ صحرا کی طرح تھے بے شمار
دوستوں میں بس بہتّر ہی تھے اس کے جاں نثار

علامہ اقبالؔ کو اہلبیت رسولؐ سے جو محبت اور عقیدت تھی اس کو بیان کرنے کے لیے دو نئے نئے پہلو تلاش کرتے ہیں۔ یہ شعر اس کی ایک مثال ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ کربلا میں باطل لشکر ہزاروں میں تھا جو امام حسینؑ کے صرف بہتر (72) جاں نثاروں کا مقابلہ کرنے کو جمع ہوا تھا۔ اقبالؔ اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ امام حسینؑ کے دشمنوں کی تعداد ریت کے ذرات کی طرح اتنی تھی کہ اس کا شمار نہیں کیا جاسکتا تھا جبکہ امام حسینؑ کے دوست صرف بہتر تھے اور یہ بھی اتفاق ہے کہ اگر یزداں (خدا) کے عدد کا شمار کیا جائے تو وہ بھی بہتر ہی ہوتے ہیں۔ یہ پہلو بھی آپؑ کے حق پر ہونے کی دلیل کہی جاسکتی ہے۔

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

☆☆☆☆

ماسو اللہ مسلماں اور کہیں جھکتا نہیں
ہو کوئی فرعون لیکن وہ کبھی ڈرتا نہیں

جب کوئی فرد خدا کی وحدانیت پر مکمل ایمان لانے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے تو اس پر پہلی عبادت جو فرض ہوتی ہے وہ نماز ہے جس میں خدا کی حمد وثناء کے ساتھ ساتھ اس کے حضور سجدہ ریز ہونا ہے۔ اگر یہ سجدہ صدق دل اور غیر متزلزل ایمان کے ساتھ کیا جائے تو یہ ان ہزاروں سجدوں سے نجات دلا دیتا ہے جو انسان غیر از اللہ کے سامنے دنیاوی خواہشات کی تکمیل یا خوف کے باعث کرتا ہے۔ اسی نکتہ کو اقبالؔ اس شعر میں بیان کرر ہے ہیں کہ ایک سچا مسلمان وہ ہوتا ہے جو صرف خدا کا بندہ ہو اور اسی کے آگے اپنا سر جھکاتا ہے اور کسی طاقت ور سے حق وصداقت کے راستے پر گامزن ہونے سے مرعوب نہ ہو، چاہے وہ فرعون یا یزید جیسا دنیاوی جاہ وجلال اور قوت کا حکمراں ہی کیوں نہ ہو۔

خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

☆☆☆☆

اس کے خوں نے راز دیں افشاں کیا
مردہ دل اقوام کو زندہ کیا

قوموں کی کردار سازی اور ذہنی ترقی کے لیے جو عوامل درکار ہوتے ہیں ان میں ایک اہم ترین عنصر وہ کردار بھی ہوتے ہیں جو اپنے عمل سے اعلیٰ ترین اقدار کے عملی نمونے ہوتے ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر اقوام عالم میں اپنا مقام حاصل کیا جا سکتا ہے، اسی لیے ہر قوم کی تاریخ میں ایسے افراد کا تذکرہ لازمی ملتا ہے۔ اقبال کے خیال میں تاریخ اسلام میں یہ مثالی کردار اہلبیت رسول کا ہے جنہوں نے اپنے عمل اور قربانیوں سے ہمارے لیے ایسی عملی مثالیں قائم کیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم نہ صرف اپنے لیے عزت و وقار حاصل کر سکتے ہیں بلکہ دیگر اقوام کی رہنمائی کا فرض بھی پورا کر سکتے ہیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنی جان خدا کی راہ میں قربان کر کے اسلام کی حقیقت کو عیاں کر دیا جو خوابیدہ قوم کو بیدار کرنے کا باعث ہوا۔

تیغ لاچوں از میاں بیروں کشید
از رگِ اربابِ باطل خوں کشید

☆☆☆☆

کھینچی اس نے میان سے جب لا کی تیغ
مار ڈالے اہل باطل بے دریغ۔

واقعہ کربلا کو عام طور پر ایک دنیاوی جنگ کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے، جہاں دو لشکر مد مقابل ہوں اور ایک دوسرے پر فتحیاب ہونے کی جدوجہد کر رہے ہوں جبکہ حقیقت میں یہ دو نظریوں کا تصادم تھا، ایک جانب وہ تھے جو اسلام کے زریں اصولوں سے انحراف کر رہے تھے اور دوسری جانب وہ قوت تھی جو ان اصولوں کی بقاء کے لیے مد مقابل تھی اور اس سے انکار کر رہی تھی (روایتی جنگ کے لیے نہ ان کے پاس لشکر تھا اور نہ ہی ساز و سامان) اسی نکتہ کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ امام حسینؑ نے

جنگ کے لیے عام تلوار کے مقابلے میں اپنی میان سے انکاریا "لا" کی تیغ نکال کر باطل کا مقابلہ کیا اور اس طرح کیا کہ باطل کی جان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گئی اور حق پرستی کی ایک مثال قائم ہوگئی۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوانِ نجات مانوشت

☆☆☆☆

نقش الا اللہ خاک کربلا پر لکھ دیا
راستہ بخشش کا یوں وا کردیا

اسلامی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو کربلا کا واقعہ اگر نہ ہوتا تو یہ صرف مسلمان بادشاہوں کی حصول اقتدار کے واقعات تک محدود ہوکر رہ جاتی اور اس میں ملوکیت کے خلاف کسی واقعہ کا تذکرہ تک نہ ہوتا جو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں سے انحراف ہے اور الا اللہ کی نفی ہے۔ امام حسینؑ نے اسی اصول کی بقاء کے لیے خدا کی راہ میں جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اقبالؔ اسی عظمت کا بیان کررہے ہیں کہ کربلا کے صحرا میں امامؑ نے قربانی پیش کرکے اپنے خون سے حرف الا اللہ کو ہمیشہ کے لیے نقش کردیا اور امت کے لیے ایک مثال ایسی روشن قائم کردی جو قیامت تک اس کی رہنمائی کرتی رہے گی، جو اس کی نجات کا راستہ اور خدا کی ذات تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

رمز قرآں از حسین آموختیم
زِ آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم

☆☆☆☆

کلیۂ قرآں ہمیں شبیرؑ سے حاصل ہوا
دل ہمارا قربت اللہ کے قابل ہوا

اسلام میں جن بنیادی عقائد پر ایمان لانا لازمی ہے ان میں اللہ کی وحدانیت اور رسولوں کی ان کتابوں پر یقین رکھنا بھی ضروری ہے جو رسولوں پر نازل کی گئیں۔ حضرت محمدؐ آخری پیغمبر ہیں اور قرآن بھی آخری کتاب ہے جو قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی، اس کے لیے ضروری تھا کہ کچھ بندے ایسے ہوں جو ان احکامات کی مثالی اور عملی تفسیر ہوں جو اہلبیت کی شکل میں

تاریخ کا حصہ ہیں، جن کے نقش قدم پر عمل کرنا نجات کا ذریعہ ہے۔ انہی میں ایک امام حسینؓ کی ذات بھی ہے، جن کے لیے اقبالؔ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کے عمل و کردار سے ہمیں قرآن کی لفظی ہی نہیں بلکہ عملی معنی بھی سمجھنے کی توفیق ہوئی کیونکہ ان کی روح میں خدا کی محبت کا جو شعلہ روشن تھا وہ ہمارے لیے ایک مشعل راہ کا درجہ رکھتا ہے۔

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت

☆☆☆☆

شان و شوکت شام و غرناطہ کی اور بغداد کی
بجھ چکی ہیں ساری شمعیں اب ہماری یاد کی

دنیا کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جو سلطنتیں دنیاوی و مادی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں ان کا عرصہ حیات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے اور آخر کار ان کے قصے تاریخ کی کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کی جاہ و حشمت کی علامتیں وہ عالیشان مقابر رہ جاتے ہیں جو ان کی یاد میں تعمیر کیے جاتے ہیں جنہیں ہر خاص و عام جب چاہے روند سکتا ہے جبکہ وہ ہستیاں جو اپنے عمل اور اعلیٰ کردار سے انسانوں کے دل و دماغ کو مسخر کر کے ان کی روح میں داخل ہو جاتی ہیں، ان کو عزت دوام حاصل ہوتی اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اسی لیے اقبالؔ نے کہا کہ وہ چاہے شام اور بغداد کی حکومتیں کی شان و شوکت ہو یا غرناطہ کا جاہ و حشم اس کو ختم ہونا تھا، اسی لیے وہ اب ہماری یادوں کا حصہ بھی نہیں رہیں۔

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

☆☆☆☆

اس کے خون سے آج بھی دیں کے بدن میں جان ہے
اس کی تکبیروں سے زندہ آج بھی ایمان ہے

کربلا کا واقعہ دنیا کی تاریخ اسلام کی خصوصاً ایک ایسی مثال ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

ہر چند کہ اس میں بظاہر امام حسینؑ کے مختصر لشکر کو شہادت نصیب ہوئی اور ان کے اہل بیت کو صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان کے مخالفین کو دنیاوی و مادی فتح حاصل ہوئی لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ دائمی کامیابی و فتح امام حسینؑ ہی کی ہوئی اور وہ حق کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے ایک مثال بن گئے جبکہ دشمنوں کو دوامی ذلت و رسوائی کی علامت قرار دیا گیا۔ یہی حقیقت اس شعر کا مفہوم ہے کہ باطل آج بھی ان کے زخموں اور شہادت سے خوف زدہ ہے اور ان کے اس عمل سے اسلام پر ایمان تازہ اور باقی ہے۔

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشک ما برخاکِ پاکِ او رساں

☆☆☆☆

اے صبا پیغام یہ لے جا مرا
ہدیۂ اشک روضے تک پہنچا مرا

ہر وہ شخص جو حق و صداقت رکھتا ہے اس کا امام حسینؑ سے عقیدت رکھنا لازمی ہے جس کا اظہار وہ ان پر ظلم و ستم کے تذکرے پر اشک بہا کر کرتا ہے اور اس کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا یہ ہدیہ کسی طرح امامؑ کے حضور پیش ہو جائے تا کہ ان تک اس کی محبت اور عقیدت کا پیغام پہنچ جائے۔ اقبالؔ بھی ان معتقدین میں شامل ہیں جن کی یہ خواہش ہے کہ امامؑ کے غم میں ان کے بہائے ہوئے آنسو کسی طرح امام حسینؑ کی خاک پا تک پہنچ جائیں۔ اس شعر میں وہ صبا سے اپنی حسرت کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر ہو سکے تو مجھ سے دور جو امامؑ کا روضہ ہے اس تک میرے اشک لے جا اور انہیں خاک پا کی نذر کر دے تا کہ میری عقیدت کا اظہار برملا ہو سکے اور میرا شمار بھی محبان اہلبیت میں ہو جائے۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

☆☆☆☆

تیر و سنان و خنجر و شمشیر ہے پسند
مت آ، کہ مجھ کو مسلکِ شبیرؑ ہے پسند

حق و باطل کے درمیان کشمکش ایک سے زیادہ طریقوں سے جاری رہتی ہے اور راہِ حق پر

جدو جہد کرنے والے اپنی علم وعمل اور کردار کی بلندی سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی ناکامی اور پسپائی کو دیکھتے ہوئے اس کے خلاف بہ زور قوت سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سوائے ہتھیار اٹھانے کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ امام حسینؑ نے کربلا میں اسی رویہ کا عملی مظاہرہ کیا جس کو اقبالؔ یہاں بیان کر رہے ہیں کہ مجھے مسلک شبیرؑ اس لیے پسند ہے کہ انہوں نے حق کے قیام کے لیے نتائج کی پروا کیے بغیر باطل کا مقابلہ تیر وسنان اور خنجر وشمشیر سے کیا جو کوئی کمزور ایمان رکھنے والی شخصیت نہیں کر سکتی۔

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خون حسینؑ بازدہ کوفہ و شام خویش را

☆☆☆☆

پیاسی ہے ترے خون کی ریگ حجاز و کربلا
مسلک شہ پہ چل کے تو کوفہ و شام کو بچا

علامہ اقبالؔ کے اس شعر کے مفہوم کا اگر سرسری جائزہ لیں تو یہ محسوس ہوگا کہ انہوں نے اس میں آج کے حالات بیان کیے ہیں کیونکہ یہاں جن مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں ویسے ہی بدتر حالات ہیں جو اس وقت تھے۔ تباہی و بربادی کی قوتیں اپنے عروج پر ہیں اور کوئی ایسی طاقت ان کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے نہیں آ رہی ہے جو حقیقی معنوں میں ان کے آگے رکاوٹ بن سکے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں قربانی کا وہ بے لوث جذبہ نہیں جو امام حسینؑ اور ان کے رفقاء میں تھا، اسی لیے علامہ امت کو نجات کے راستے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عراق یا حجاز یا کوفہ و شام ہر جانب تباہی و بربادی ہے جس کو صرف امام حسینؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے روکا جا سکتا ہے۔

از نگاہِ خواجۂ بدرو حنین
فقر سلطاں وارث جذب حسینؑ

☆☆☆☆

یہ سب کرم ہے فاتح بدرو حنین کا
وارث بنا ہے ٹیپو بھی جذب حسینؑ کا

برصغیر کی تاریخ میں اگر کسی حکمران کو حقیقی معنی میں شہادت کا رتبہ حاصل ہوا ہے تو وہ میسور کی ریاست کے فاتح ٹیپو سلطان کو نصیب ہوا جس نے ہندوستان پر قابض ہونے کے خواہشمند فرنگیوں کے خلاف جہاد کیا اور اپنوں کی سازشوں کا شکار ہو کر میدان جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ آج بھی لوگ اس کے مزار پر اظہار عقیدت کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ اقبالؔ بھی خود کو اس کے عقیدت مندوں میں شمار کرتے تھے جس کا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا ہے کہ یہ ٹیپو سلطان کی آل رسولؐ سے عقیدت کا ہی فیض ہے کہ وہ فقر کی اس منزل پر تھا جہاں حق کے لیے قربانی دینا مشکل نہیں ہوتا، اسی لیے اقبالؔ اس کو امام حسینؓ کے جذبہ شہادت کا وارث قرار دیتے ہیں۔

گرچہ ہر مرگ است برمومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دیگر

☆☆☆☆

موت ہر مومن کو گرچہ ہے پسند
پر شہادت شہ کی ہے سب سے بلند

فلسفہ اقبال میں مرد مومن ایک ایسا مثالی کردار ہے جو امت کی نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے کیونکہ فقر کی اس منزل پر ہوتا ہے جہاں کوئی مادی حرص و ہوس اس کو بہکا نہیں سکتی اور نہ ہی وہ کسی دنیاوی قوت کے آگے سرنگوں ہوتا ہے بلکہ وہ وقت آنے پر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے بھی تیار رہتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ حق کے قیام کے لیے اگر اپنی جان بھی قربان کر دے تو اس کے لیے مقام شکر ہوتا ہے مگر اس جذبہ صداقت کے باوجود اقبالؔ کے خیال میں امام حسینؓ کی قربانی اس سب سے افضل ہے اور اس کا مقام سب سے جدا ہے کیونکہ وہ راہِ حق میں شہید ہونے والی پہلی ہستی ہیں، باقی سب ان کی پیروی کرتے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

قلندر میل تقریرے ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
☆☆☆☆
قلندر کے لیے مہمل سی اک تقریر کیا ہے
فقط اس نکتے کے اکسیر کیا ہے

آج کل اگر ہم اپنے اطراف کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہر طرف ایسے لوگ زندگی کے مختلف مسائل کے حوالے سے تقریریں کر رہے ہیں جو بڑی عالمانہ محسوس ہوتی ہیں اور ان سے عام شخص وقتی طور پر مرعوب بھی ہوتا ہے لیکن اس کے کردار میں کوئی قابل ذکر تبدیلی محسوس نہیں ہوتی اور اپنی سابقہ روش پر ہی کاربند رہتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے خیال میں اس کی اصل وجہ ان مقررین کا اصل نکتہ جو امت کے لیے اکسیر کا درجہ بیان کرنا ہے اس کا فقدان ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ بے مقصد ہو جاتی ہیں، اسی لیے قلندر جیسے لوگ جو حقیقت کا عملی ادراک رکھتے ہیں ان پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور یہ ان کے نزدیک مہمل الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتے۔

ازاں کشتِ خرابے حاصلے نیست
کہ آب از خونِ شبیرؑے ندارد
☆☆☆☆
زمیں شور سے حاصل نہیں کچھ
بجز خونِ شہیداں پانی کی تاثیر ہی کیا

علامہ اقبالؔ کی شاعری، فکر و فلسفہ کا بنیادی مقصد امت کے کردار کی بلندی اور علم و عمل کی جانب راغب کرنا ہے تاکہ وہ موجود پستی سے نکل کر دوبارہ عظمت رفتہ حاصل کر سکے لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب وہ اسلام کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرے جس کے بغیر کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ یہاں انہوں نے امت کی حالت ایک شور شدہ زمین سے دی ہے جس پر کوئی طریقہ آزما لیا جائے، وہ ہری نہیں ہو سکتی، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ شور والی زمین یعنی امت کی حالت میں بہتری کے لیے ضروری ہے کہ اس میں امام حسینؓ کی قربانی والا جذبہ ہو، اس لیے اس جذبہ کے بغیر پانی کی بھی کوئی تاثیر نہیں ہوگی جس سے حالات بہتر ہوں۔

ڈاکٹر جمال نقوی کی دیگر کتب

۱۔ گلہائے عقیدت (منقبتی مجموعہ) ۱۹۸۵ء
۲۔ مکان شیشے کا (شعری مجموعہ) ۱۹۸۷ء
۳۔ انجینئرنگ ہوریزن (انگریزی مضامین) ۱۹۹۵ء
۴۔ آئی ایم ایف پاکستان کی سیاسی معیشت (ترجمہ) ۱۹۹۷ء
۵۔ خوشبو گلابوں کی (عالمی تراجم وطبع زاد نظمیں) ۱۹۹۷ء
۶۔ ادب اور سائنس (تالیف) ۱۹۹۹ء
۷۔ ننھے سورج دیس کے (مجموعہ ہائیکو) ۲۰۰۰ء
۸۔ قلم کا سفر (تالیف) ۲۰۰۰ء
۹۔ قلم برائے امن (تالیف) ۲۰۰۱ء
۱۰۔ قائدین پاکستان (پاکستانیات) ۲۰۰۲ء
۱۱۔ مزاج سخن (مجموعہ غزلیات) ۲۰۰۳ء
۱۲۔ ادب، سائنس اور جمہوریت (تنقید) ۲۰۰۴ء
۱۳۔ نقد ومحض (تنقید) ۲۰۰۵ء
۱۴۔ کہانیاں دیس دیس کی (تراجم) ۲۰۰۶ء
۱۵۔ ترقی پسند تحریک، ادب اور سجاد ظہیر (تنقید) ۲۰۰۶ء
۱۶۔ زندگی کا سورج (شعری مجموعہ) ہندی ۲۰۰۷ء
۱۷۔ جمال وکمال (یادداشتیں) ۲۰۰۷ء
۱۸۔ ہجرت (ترجمہ) ۲۰۰۸ء
۱۹۔ بلاوا (سفرنامہ) ۲۰۰۹ء
۲۰۔ مجنوں گورکھپوری۔ شخصیت وفن (تنقید) ۲۰۱۰ء
۲۱۔ پنج رنگ (انتخاب کلام مع ترجمہ) ۲۰۱۰ء
۲۲۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (تاریخ) ۲۰۱۱ء
۲۳۔ فیض کا فکری ابلاغ (تنقید) ۲۰۱۱ء
۲۴۔ ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال (تحقیق) ۲۰۱۲ء
۲۵۔ ارمغان ممتاز (تالیف) ۲۰۱۲ء
۲۶۔ دھنک رنگ (انتخاب کلام مع ترجمہ) ۲۰۱۲ء
۲۷۔ ابراہیم جلیس۔ انسان اور قلم کار ۲۰۱۳ء
۲۸۔ ترقی پسند ادب کے معمار (تذکرہ نگاری/تحقیق) ۲۰۱۳ء
۲۹۔ روشن راہیں (کالموں کا مجموعہ) ۲۰۱۴ء
۳۰۔ نئے دن کی بشارت (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء
۳۱۔ ادب اور سماجی شعور (تنقید) ۲۰۱۵ء
۳۶۔ ڈاکٹر جمال نقوی کی ادبی خدمات ۲۰۱۵ء
۳۳۔ ادب اور عصری شعور (تنقید) ۲۰۱۶ء
۳۴۔ ہمہ جہت اقبال (تنقید) ۲۰۱۶ء
۳۵۔ ہمکلام (مکالمے) ۲۰۱۷ء
۳۶۔ ترقی پسند ادب کے پچاس سال (دوسرا ایڈیشن) ۲۰۱۷ء
۳۷۔ ڈاکٹر منظور احمد کی یادیں ۲۰۱۷ء
۳۸۔ ادب اور عصری شعور (تنقید) ۲۰۱۶ء
۳۸۔ سرسید کے نورتن (مضامین) ۲۰۱۸ء
۳۹۔ عقیدتیں (حمد، نعت، منقبت) ۲۰۱۸ء
۴۰۔ رثائی ادب (مرثیہ، سلام، نوحے) ۲۰۱۹ء
۴۱۔ ہمہ رنگ غالب (تنقید) ۲۰۲۰ء
۴۲۔ جمال نقوی۔ شخصیت وفن (تحقیق) ۲۰۲۰ء
۴۳۔ تحریک علی گڑھ سے تحریک پاکستان تک ۲۰۲۱ء
۴۴۔ معجزۂ فن (اقبال کے منتخب فارسی کلام کا ترجمہ) ۲۰۲۱ء
۴۵۔ منتخبات مجنوں (انتخاب) زیر طبع
۴۶۔ سندھ کے ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات (تالیف) زیر طبع
۴۷۔ اکیسویں صدی (سائنسی مضامین) زیر طبع
۴۸۔ ترقی پسند تحریک کا سفر (اگلا پڑاؤ) زیر طبع
۴۹۔ ہائیکو دبستان انتخاب زیر طبع
۵۰۔ ترقی پسند نظم کا سفر (تحقیق) زیر طبع
۵۱۔ ترقی پسند ادب کے معمار (دوسری جلد) زیر طبع
۵۲۔ ہندی کہانیاں (ہندی سے ترجمہ) زیر طبع
۵۳۔ انتخاب کلام (جدید اضافوں کے ساتھ) زیر طبع
۵۴۔ برصغیر کی ایک اہم شخصیت (سرسید) زیر طبع
۵۵۔ زندگی کی اہم یادیں (علی گڑھ کے روز وشب) زیر طبع
۵۶۔ میری شخصیت کا تربیتی مرکز (لکھنؤ) زیر طبع



تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

علامہ محمد اقبال